اُردو افسانے کے عہد بہ عہد رُجحانات

اُردو میں افسانہ نگاری کا آغاز بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں ہوا۔ بطور ایک صنف اُردو افسانہ مغربی صنفِ ادب شارٹ سٹوری کی پیروی میں شروع ہوا لیکن کہانی کہنے، سننے اور لکھنے کی روایت برِصغیر میں قدیم سے موجود ہے۔ رگ وید، مہابھارت، ارتھ شاستر، کتھاسرت ساگر اسی روایت کی بنیادیں ہیں۔ مسلمانوں کے دورِ حکومت میں عرب کی داستانوی روایت کو فروغ ملا، جب اُردو زبان کو وسیلۂ اظہار بنایا گیا تو یہی روایت اُردو میں منتقل ہوئی۔ اُردو میں داستان نویسی کا رواج دکن میں "سب رس" سے ہوتا ہے۔ 'سب رس' کے بعد باغ و بہار، آرائشِ محفل، رانی کیتکی کی کہانی، فسانۂ عجائب، طلسمِ حیرت، گل صنوبر اور داستانِ امیر حمزہ زیادہ مشہور ہوئیں۔ یہ داستانیں تلاش و جستجو اور حیرت و تجسس کے قصہ در قصہ واقعات کے لامتناہی سلسلے پر مشتمل تھیں۔ یہ داستانیں قدیم دور کے انسان کی سوچ اور عمل کی بھرپور ترجمانی کرتی ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب برِصغیر پاک و ہند میں حالات میں تبدیلی آئی۔ اب اکٹھے بیٹھ کر خوش گپیاں کرنے، اور دل بہلانے، تفریحِ طبع کے لیے داستانیں سننے سنانے کے مواقع کم ہوتے چلے تو داستانوں کا زور بھی ٹوٹ گیا۔ اب نئے حالات میں کہانی کا نیا رُوپ ناول کی صورت میں سامنے آیا۔ ناول منضبط دائروں میں زندگی کے حقائق کو حقیقت کی نظر سے دیکھنے کا عمل ہے۔ واقعات میں ترتیب و تنظیم، آغاز، پھیلاؤ سب سائنسی دور کے میکانکی تقاضوں کا پرتو ہے۔ انھی تقاضوں نے مختصر افسانے کے لیے بھی راہ ہموار کی، مختصر افسانے میں کہانی ایک اکائی کو اُبھارتی اور ختم ہو جاتی ہے۔

پروفیسر وقار عظیم لکھتے ہیں:

''کسی ایک واقعے، ایک جذبے، ایک احساس، ایک تاثر ایک اصلاحی مقصد، ایک رومانی کیفیت کو اس طرح کہانی میں بیان کرنا کہ وہ دوسری چیزوں سے الگ اور نمایاں ہو کر پڑھنے والے کے جذبات واحساسات پر اثر انداز ہو۔ افسانے کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس نے اسے داستان اور ناول سے الگ کیا۔''(۱)

زندگی کی برق رفتاری مختصر افسانے کے آغاز کا محرک بنی۔ معاشی اُلجھنوں اور ترقی کے مادی نظریے کی بدولت فرصت کے لمحات رفتہ رفتہ کم ہونے لگے۔ سیاسی وسماجی اُلٹ پھیر نے مسائل کا دائرہ وسیع کر دیا۔ اب زندگی کی گہما گہمی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ایسی صورتِ حال میں طویل قصوں کہانیوں کی بجائے ایسی کہانیوں کی ضرورت تھی جو کم سے کم وقت میں ذوقِ جمال کی تسکین کا باعث بنے۔ مختصر افسانے نے اسی ضرورت کو پورا کیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ صنف اِبتدا ہی میں عوام وخواص میں مقبول ہوگئی اور سب کی دل چسپی کا ذریعہ بنی۔ مختصر افسانہ چونکہ کم جگہ گھیرتا اور ایک ہی نشست میں پڑھے جانے کی خوبی رکھتا تھا۔ لہٰذا یہ آغاز میں ہی اخبارات، رسائل وجرائد میں چھپنے لگا۔ اُردو افسانے نے کم عمر میں ہی بہت سی منازل کامیابی سے طے کیں۔ اگرچہ اس میں تغیر وتبدل بھی ہوتا رہا۔ نئے زاویے، نئے نظریات، نئے رُجحانات اور نئی تحریکیں بنتیں رہیں اور اُردو ادب کی دیگر اصناف کی طرح اُردو افسانے پر بھی اثر انداز ہوتی رہیں۔ لہٰذا اُردو افسانے نے اِبتدا سے اب تک ہر تغیر وتبدل کو کامیابی سے اپنے اندر جذب کیا اور بہت سے تسلی بخش اِمکانات سامنے آئے جس نے اُس صنف کی ترویج وترقی میں اہم کردار ادا کیا۔

انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کی اِبتدا میں ہندوستان میں رُومانیت کا آغاز ہوا، جب برصغیر کا سیاسی، معاشی اور معاشرتی ڈھانچہ عدم استحکام کا شکار تھا۔ اس دور میں مختلف تحریکوں کے ذریعے سیاسی، سماجی بیداری پیدا کرنے اور آزادی حاصل کرنے کی کوششیں کی جارہی تھیں۔ اُردو افسانے کی اِبتدا میں رُومانیت اور حقیقت نگاری کے دو مختلف رُجحانات کا غلبہ تھا۔ سجاد حیدر یلدرم رومانویت کے سُرخیل تھے اور منشی پریم چند حقیقت نگاری کے علمبردار۔ مجموعی طور پر اُردو افسانے پر رومانویت کا غلبہ رہا جو تقریباً تیس برس تک برقرار رہا۔

عہدِ غلامی سے لے کر آزادی تک قومی سطح پر بہت سے سانحے رُونما ہوئے جن کے زیرِ اثر برصغیر کی عوام میں سماجی شکنجوں سے نجات کی خواہش پیدا ہوئی۔ محولہ بالا حالات کا اثر اُردو افسانہ پر بھی

ہوا، چنانچہ افسانہ نگاروں نے موجودہ زندگی سے غیر مطمئن ہو کر تخیلاتی دُنیا میں پناہ لی غرض معاشرتی جکڑ بندیوں، ذہنی کرب ناکیوں اور تلخ معاشرتی حقائق و واقعات نے تمام افسانہ نگاروں کو رومانی تصورِ حیات کا اسیر کر دیا، چنانچہ رومانیت کا اسیر افسانہ نگار خوابوں، خیالوں کی دُنیا کی سیر کرتا اور باطنی مسرت کے حصول کے لیے کوشاں رہتا، چنانچہ تخلیق کار ایسی فطری مسرت اور ذہنی اور جذباتی آزادی کے خواہاں تھے جو حقیقی دُنیا میں ناپید تھی۔ چنانچہ افسانہ نگار ذہنی طمانیت اور آسودگی کے حصول کی خاطر مختلف افسانے تخلیق کرتے رہے یہ مختلف معاشرتی اضطراب اور سماجی جکڑ بندیوں اور پابندیوں کے خلاف ردِ عمل تھا، جس نے تمام افسانہ نگاروں کو ایک پلیٹ فارم پر کھڑا کر دیا۔ سجاد حیدر یلدرم کو رومانوی تحریک کا علمبردار کہا جاتا ہے۔ یلدرم کے پیروکاروں کی خاصی تعداد ہے۔ دبستانِ یلدرم میں رومانیت کی متاثر کُن رو کا اظہار ملتا ہے۔ رومانی دبستان میں سے جمال پرور واقعات اور لطف و نزاکت سے بھرپور کردار اُبھرتے ہیں۔ اس ماحول میں بنیادی شناخت تخیّل اور جذبے کی فراوانی ہے۔ رومانوی تحریک سے وابستہ افسانہ نگار، قارئین کو ہیجان پرور نغموں اور جمال آشنا زمزموں سے آشنا کرنا چاہتے تھے جو انھیں آسودگی کی جانب لے جائے۔ اب یہ افراد جمود کو توڑنا چاہتے تھے۔ ''یلدرم اور ان کے رُفقاء۔۔۔ کے ہاں کہانی کے موضوعات میں سرِفہرست، پُرمسرت زندگی کے لیے کسی گوشۂ عافیت کی تلاش کا عمل ہے۔ ذہنی ناآسودگیوں سے چھٹکارا، سماجی حدود و قیود سے رہائی اور کرب کی اِس دُنیا سے فرار و روپوشی کی اُمنگ مختلف رنگوں میں ڈھل کر سامنے آتی ہے۔''(۲)

۱۔ سجاد حیدر یلدرم رومانوی تحریک کے علمبردار تھے ان کے افسانوں میں محبت کی حکمرانی اور رومانوی فضا کا غلبہ دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے پہلی مرتبہ انسان کے بنیادی اور جبلی تقاضوں کو پیش کیا۔ یلدرم نے اپنے افسانوں میں عورت اور مرد کے جذباتی و جسمانی رشتے کو قدرے تفصیل کے ساتھ پیش کیا۔ انھوں نے قوتِ متخیّلہ کے بل بوتے پر شاداب عشق کے نغمے الاپے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نثر میں شیرینی ہے اور افسانوں میں تشبیہات و استعارات کا استعمال قاری کو فرحت بخش احساس میں مبتلا کرتا ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں بنیادی توجہ منظر کے باطن میں پوشیدہ حُسن پر دِکھائی گئی ہے۔ ایسا حُسن جو نفسی کیفیات کو برانگیختہ کرے اور قاری کو لطف و سرور کی دل کش منزل کی طرف لے جائے جو افسانہ نگار کی اصل کاوِش ہے۔ یلدرم کے افسانوں میں عورت ایک نئے اور مختلف رُوپ میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ وہ عورت کو زندگی کے صحت مند تصوّر کی علامت سمجھتے ہیں۔ یلدرم شاعرانہ مزاج رکھتے تھے۔ انھوں نے نثر

میں شاعری کی۔ یلدرم کی عطا یہ ہے کہ انھوں نے اردو افسانے کو مشرقی دائرے سے نکال کر ایک وسیع فضا میں پہنچا دیا۔

۱۸۶۸ء

۱۔ راشد الخیری کے افسانوں میں معاشرتی اصلاح پسندی کا عنصر غالب ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورت کی زبوں حالی کو پیش کیا۔ انھوں نے عورت کی تعلیم و تربیت، اصول خانہ داری، حفظان صحت، نگہداشت، طلاق، جہیز اور دیگر ہندووانہ قبیح رسوم و رواج کو موضوع بنایا۔ ان کی تحریروں میں مشرقی روایات اور تہذیب کی حفاظت کا جذبہ پایا جاتا ہے۔ راشد الخیری معاشرے کو بے معنی رسوم و رواج، باطل اعتقادات اور توہمات سے نجات دلانے کے تمنائی تھے۔ انھوں نے چار دیواری میں مقیم گھریلو عورت کے مسائل کو سمجھا اور حقوق نسواں کے لیے آواز بھی بلند کی۔

۲۔ ۱۸۸۸ء سلطان حیدر جوش اصلاحی نقطۂ نظر کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ جوش نے اپنے افسانوں میں مسلمان تعلیم یافتہ لڑکیوں اور مغربی تہذیب و تمدن کی پیروی کرنے والے نوجوانوں کے اخلاقی بگاڑ کو موضوع بنایا ہے۔ جوش افسانوی کرداروں کی زبانی اپنا نقطۂ نظر بیان کرتے ہیں یعنی وہ مغربی دُنیا کی تقلید کی مخالفت اور مشرق کی صحت مند روایات اور تہذیب و تمدن کی حمایت کرتے ہیں۔ اگرچہ جوش کے افسانے مقصدیت کا پرچار کرتے ہیں لیکن یہ افسانے اصلاحی رنگ کے حامل ہونے کے باوجود تحریر میں چاشنی اور اثر انگیزی کے حامل ہیں۔ ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے کہ ''جوش کے اکثر افسانے۔۔۔ محض وعظ و نصیحت کا مقصد پورا کرتے ہیں۔''(۳)

۳۔ ۱۸۸۴ء نیاز فتح پوری، سجاد حیدر یلدرم سے بہت متاثر تھے انھوں نے زبان و بیان کی لذت کی جانب توجہ مبذول کی۔ ان کے افسانوی کردار، طبقہ خواص سے تعلق رکھتے ہیں۔ انھوں نے مذہبی پیشواؤں اور رہنماؤں کی منافقت کو موضوع بنایا۔ نیاز کے اِبتدائی افسانوں میں طنز کی شدت نمایاں ہے۔ انھوں نے سماجی مسائل اور نفسیاتِ انسانی کی گرہوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے۔ نیاز فتح پوری ایک ایسے رومانی ادیب ہیں جن کے افسانوں میں عورت کا حسن اس کی نزاکت غرض عورت کا ذِکر بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔

مجنوں گورکھپوری کے افسانے خالص رومانی ہیں۔ ان کے افسانوں میں محبت کی ناکامیاں اور تلخیاں موضوع بنتی ہیں۔ ان کے افسانوں میں مرد اور عورت کی محبت کا جذبہ بھی نظر آتا ہے، اور تلخ سماجی حقیقتوں کی جھلکیاں بھی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے افسانوں کی فضا رومانی ہے۔ ان کے افسانے حقیقت اور رومان کے حسین امتزاج پر مشتمل ہیں۔

۵۔ اوپندر ناتھ اشک نے معاشی، معاشرتی مسائل کو موضوع بنایا۔ اشک نے اپنے افسانوں میں ہندو معاشرے کے نچلے اور متوسط طبقے کے کرداروں کے مسائل کی نشاندہی کی ہے۔ علاوہ ازیں انھوں نے عورت کی حالتِ زار کی ترجمانی بھی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں اقتصادی بدحالی، جہالت، تنگ نظری کا رُجحان دکھائی دیتا ہے۔[۷] بدری ناتھ سدرشن کے ابتدائی افسانوں میں مثالیت، رُومانویت اور جذباتیت کے عناصر واضح نظر آتے ہیں انھوں نے متوسط اور نچلے طبقے کی حالتِ زار معاشی حالات، تنگ نظری، بے جا رسوم و قیود، طبقاتی امتیاز، چھوت چھات، کم عمر کی شادی اور دیگر معاشرتی موضوع پر قلم اُٹھایا۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا خیال ہے کہ ان کے کردار زندگی کا تلخ تجربہ کر کے۔۔۔ لالچ سے دُور ہٹتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ قناعت پسندی کی انتہائی حدوں میں گم ہو جاتے ہیں۔"(۴)

۶۔ خواجہ حسن نظامی نے داستانوی طرز کے افسانے لکھے، انھوں نے تاریخِ اسلام کی جاہ و حشمت، اپنے ملک کی روایات کو مصلحانہ انداز میں پیش کیا۔[۷] حکیم احمد شجاع کے افسانوں میں رومانویت اور اِصلاحی مقصد کا امتزاج ملتا ہے انھوں نے مثالی کرداروں سے معاشرتی قدروں کے اِستحکام کی کوشش کی۔ وہ قاری کو تصوراتی دُنیا میں لے جاتے ہیں۔ احمد شجاع کے افسانوں کی یہ خوبی ہے کہ رومانی لحن کے باوجود وہ سماجی حقائق سے قارئین کو آگاہ کراتے ہیں۔[۸] علی عباس حسینی کے افسانوں میں رومان وحقیقت کا امتزاج ملتا ہے۔ انھوں نے "جنس" کو زندگی کی حقیقت کے طور پر پیش کیا۔ انھوں نے محنت کش کسانوں، دیہی طبقہ کے گھریلو حالات، تنگ دستی، غربت، مزدوروں کی مفلوک الحالی، مہاجنوں اور زمینداروں کے استحصال کو موضوع بنا کر معاشرتی بُرائیوں کو بے نقاب کیا۔ ان کے افسانوی کردار حب الوطنی کے جذبے سے مملو ہیں۔ علی عباس حسینی، ہندو مسلم فسادات اور ہندو مسلم نفاق کے مخالف تھے۔ ان کے افسانوں میں حب الوطنی کا جذبہ موجود ہے۔ افسانہ نگار اعلیٰ انسانی قدروں کے خواہش مند ہیں۔ علی عباس حسینی کے مقبول افسانوں میں باسی پھول، میلہ گھومنی، رفیقِ تنہائی، بہو کی ہنسی شامل ہیں۔[۹] اعظم کریوی کے افسانوں میں دیہات اور دیہی زندگی پوری جزئیات کے ساتھ موجود ہے وہ برطانوی سامراج کے ظلم وستم اور کسانوں کے استحصال کو پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے ہندوستانی معاشرے کے بے بس اور کمزور طبقے کی زندگی پر روشنی ڈالی، بدری ناتھ سدرشن نے سماجی تبدیلیوں کو موضوع بنایا۔ انہوں نے معاشرے کو ایک برہمن کی نظر سے دیکھا اور سماجی تبدیلیوں کو ہندو غلبے کی صورت میں پیش کیا تاہم جب وہ انسانی معاشرے کی صادق قدروں کو افسانے کی بنت میں شامل کرتے تو ان کا تعصّب دب جاتا۔۔۔ سیاسی آدرش میں پریم چند کے مقلد ہی نظر

۱۸۹۷ء ۱۸۹۸ء ۱۸۹۶ء

آتے ہیں۔ (۵) حامد اللہ افسر نے اپنے افسانوں میں مسلمان معاشرہ اور مسلمان کی زندگی کو حقیقت پسندی سے پیش کیا۔ بعض اوقات ان کے افسانوں پر نصیحت کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ احمد اکبر آبادی نے اپنے افسانوں میں رومانیت کے غلبے کو فلسفے کی بصیرت کے ساتھ پیش کیا۔ مسز عبدالقادر کے افسانوں میں انسان مافوق الفطرت عناصر سے دوچار ہوتا ہے انہوں نے عناصرِ فطرت کو خوف کا سرچشمہ قرار دیا۔ ان کے افسانوں میں ''صنوبر'' پاداشِ عمل اور بلائے ناگہاں شامل ہیں۔ مسز عبدالقادر اپنے فن میں منفرد افسانہ نگار تھیں کہ ان کے افسانوں میں رومانی عناصر کے ساتھ ساتھ خوف اور دہشت کی فضا بھی قائم رہتی ہے۔ حجاب امتیاز علی کے افسانوں میں رومانی فضا کا غلبہ رہتا ہے۔ ان کے افسانے صنوبر کے سائے، میری ناتمام محبت، وہ بہاریں یہ خزائیں، رومانی کیف کے حامل ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں سوانحی رنگ کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔ علاوہ ازیں حجاب کی افسانوی تخلیقات میں مصنفہ کی اپنی شخصیت کا عکس بھی نظر آتا ہے۔ قاضی عبدالغفار نے عورت کی نفسیات اور انسانی جذبات و احساسات کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی فضا رومانوی انداز و اسلوب کی حامل ہے۔ مرزا ادیب کو رومانی تحریک سے وابستہ تخلیق کار کہا جاتا ہے۔ ان کے افسانوں میں برطانوی سامراج پر طنز دکھائی دیتا ہے۔ علاوہ ازیں مرزا ادیب کی تحریروں میں انسانی جذبات و احساسات کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے معاشرے کی بے رحم حقیقتوں کو بے نقاب کیا اور ایک آزاد، پُرامن اور خوش حال معاشرے کی تشکیل کی خواہش کا اظہار کیا جو فرد کو آزادی دے اور معاشرتی انصاف کی خواہش کو پیدا کرے جو فرد کو اِس کے بنیادی حقوق کا شعور عطا کرے۔

محولہ بالا افسانہ نگاروں نے اپنی تحریروں میں معاشرتی تلخیوں کو کم کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اگرچہ معاشرتی المیے، سماجی بے چینی اور اضطراب کو فن کا موضوع بنایا لیکن ان کے افسانوں میں جذبات و احساسات، تخیل آفرینی، حسن و محبت اور روشن خیالی کا غلبہ بھی نظر آتا ہے۔ انہوں نے زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کو رومانیت کی آمیزش سے پُرلطف اور فکر انگیز پیرائے میں بیان کیا۔ اب افسانہ نگار تخیل و تصورات اور اَن دیکھی دنیا کی سیر کی بجائے زندگی کی پُرپیچ حقیقتوں اور معاشرتی مسائل کو بیان کرنے لگا۔ رومانی افسانہ نگاروں نے اردو کہانی کو شفاف، شگفتہ اور لطیف زبان میں لکھا۔ اسلوب میں نہ صرف روانی، سلاست اور دل نشینی کی صفات پیدا کیں بلکہ کیفیات، جذبات اور احساسات کو مجسّم کرنے کا فن بھی وضع کیا۔ حسن، نفاست، شعریت، نغمگی اور جمال کے مرقعے پیش کر کے نثر کے کم و کیف کو دوچند

کر دیا۔ داستانوی دور کی مقفیٰ و مسجع اور سرسید عہد کی سپاٹ نثر کے مقابلے میں دبستانِ یلدرم کی نثر شائستہ، شستہ، متحرک اور زندگی سے بھر پور نظر آتی ہے۔ لفظ و معنی اور صوت و آہنگ کا جاندار تعلق زبان کی بے کیفی اور مجہولی کو دور کر کے ایک نئی حسیت بیدار کرتا دکھائی دیتا ہے۔ ایسی حسیت جو زندگی کے انتہائی لطیف و مہین نقطوں تک بھی رسائی رکھتی ہے اور حسن و خیر کے انتہائی پوشیدہ گوشوں کو بھی پوشیدہ نہیں رہنے دیتی۔ (۶)

رومانی تحریک سے وابستہ افسانہ نگار اپنی تحریروں میں عصری حقیقتوں، امکانی سچائیوں، نفسیاتی پیچیدگیوں کی عکاسی کرتے رہے۔ اگر چہ اس میں ادوار کے تقاضوں کے مطابق تغیر و تبدل بھی ہوتا رہا، اگر چہ رومانی تحریک کے تحت لکھے گئے افسانوں میں موضوعاتی، نفسیاتی، اسلوبیاتی اور تکنیکی سطحوں پر بہت سی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ رومانی تحریک اردو ادب کی ایسی پُر اثر تحریک ہے جس کی اہمیت، افادیت سے انکار ممکن نہیں۔ ڈاکٹر محمد عالم رومانی افسانے کے متعلق لکھتے ہیں:

چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ اردو افسانے کی تاریخ میں رومانی افسانہ بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ اور اپنے تسلسل میں مستقلاً اردو کے افسانوی ادب کا حصہ رہے گا۔ (۷)

بیسویں صدی کے آغاز میں رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کے رجحان کا بھی غلبہ رہا۔ دبستانِ یلدرم سے تعلق رکھنے والوں نے زندگی کے خوش گوار پہلوؤں، عشق و محبت، عورت کے روپ میں محبت، حسن، خیر، سکون اور مستقبل کے حسین امکانات کے متعلق لکھا۔ انہوں نے تخیل کے بل بوتے پر ماضی بعید اور مستقبل کی خوبصورت آئیڈیل زندگی کا عکس افسانوں میں پیش کیا۔ جب کہ حقیقت نگاری کے تحت لکھنے والوں نے ارضِ وطن کو اپنا محبوب بنایا۔ انھوں نے وطن کی محبت، حسن اور عظمت کے گیت گائے۔ حقیقت نگاری کا رجحان رومانیت کا ردِ عمل تھا۔ رومانی ادیب تخیل کی آنکھ سے مختلف توجیہات سامنے لاتا ہے، جب کہ حقیقت نگار شے کا ظاہری پہلو تلاش کرتا ہے۔ ظاہر کی پرتیں کھولنے کے ساتھ ساتھ، اس کے باطن میں اُترتا اور جو کچھ دکھائی دیتا ہے بیان کر دیتا ہے۔

۱۹۸۰ء پریم چند کی تحریروں میں حقیقت نگاری کا اولین زاویہ حبِ وطن، قومی یکجہتی قومی آزادی کی صورت میں منظرِ عام پر آیا۔ ان کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ ''سوزِ وطن'' میں وطن کی محبت، قومی غیرت و حمیت اور غیر ملکی تسلّط کے خلاف اشتعال انگیز رویوں کی ترجمانی ملتی ہے۔ ان افسانوں میں وطن کی عظمت برقرار رکھنے کی نصیحت ملتی ہے۔ وطن کی محبت میں جان قربان کرنے کا واضح اشارہ بھی ملتا ہے۔ علاوہ ازیں خون کا آخری قطرہ تک وطن کی محبت پر بہا دینے کا بیان ملتا ہے۔ ''سوزِ وطن'' کے بعد پریم چند کے افسانوی مجموعے

"پریم پچیسی، پریم بتیسی، خاک پروانہ، خواب و خیال، فردوسِ خیال، پریم چالیسی، آخری تحفہ، زادِ راہ، دودھ کی قیمت اور واردات شائع ہوئے۔ ان افسانوی مجموعوں میں ان کا فن ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہے جیسے جیسے عصری تقاضے اور تناظر بدلتے جاتے ہیں، ویسے ہی ان کے موضوعاتی دائرہ میں بھی وسعت آتی جاتی ہے۔ پریم چند نے نام نہاد مذہبی ٹھیکے داروں، مہاجروں کے استحصال، خواتین کی معاشرتی حالت، بے جوڑ شادی، بیوہ کی زندگی، سوتیلی ماں کے ناروا سلوک، منافقوں، مظلوموں، ناانصافیوں، زندگی کی تلخیوں کے شکار افراد کی حالتِ زار کو بیان کیا۔

پریم چند نے اپنے عہد کی معاشرتی عکاسی کی، پریم چند کی حقیقت نگاری سے ان کے عہد میں سدرشن، اعظم کریوی، علی عباس حسینی اور عاشق حسین بٹالوی نے گہرا اثر قبول کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار بھی ان سے فیض یاب ہوئے۔ پریم چند کے مقلدین نے ان کی تبلیغ کی اور موضوعات، تکنیک اور اندازِ بیان میں پریم چند کا ہی رنگ واضح دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

> "اُردو افسانے میں حقیقت نگاری کی روایت پریم چند ہی کے ہاتھوں پروان چڑھی لیکن یہ واقعہ ہے کہ بیسویں صدی کی اِبتدا میں اُردو ادب میں رومانی افسانہ نگاروں ہی کا دور دورہ تھا۔ حقیقت نگاری کے فروغ کا زمانہ صحیح معنوں میں انگارے کی اشاعت اور انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے قیام کے بعد شروع ہوتا ہے۔"(۸)

اُردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا آغاز انجمنِ ترقی پسند مصنّفین کے قیام سے ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے یوں تو اردو ادب کی مختلف اصناف پر گہرے اثرات مرتب کیے لیکن اردو افسانے کے حوالے سے یہ اثرات زیادہ نمایاں ہیں۔ اس تحریک کی بدولت اردو افسانے نے ایک قلیل مدت میں عروج حاصل کیا۔ اس عہد میں اردو افسانے میں موضوعات، تکنیک و ہیئت اور اُسلوبیاتی سطح پر متنوع تجربات سامنے آئے بلکہ اردو افسانے کا نئے امکانات کی جانب قدم بڑھانے کے عمل کا بھی آغاز ہوا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو افسانے کے لیے ایک مربوط ڈھانچہ بہم پہنچایا۔

ترقی پسند نظریات کے زیرِ اثر اردو افسانے میں تین طرح کے رجحانات منظرِ عام پر آئے۔ اوّل سماجی حقیقت نگاری کا رجحان، جس کے نمائندہ افسانہ نگاروں میں حیات اللہ انصاری، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، اختر اورینوی، سہیل عظیم آبادی، بلونت سنگھ اور شوکت صدیقی شامل ہیں۔ دوم انقلابی رومانی حقیقت نگاری کا رجحان، جس کی نمائندگی کرشن چندر، غلام عباس، احمد ندیم قاسمی،

خواجہ احمد عباس، مہندر ناتھ، اور انور عظیم نے کی۔ سوم بے باک حقیقت نگاری کے رجحان کی نمائندگی کرنے والوں میں سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، عزیز احمد اور احمد علی شامل تھے۔ محولہ بالا تینوں رجحانات اپنی انفرادی جہتوں کے ساتھ اس تحریک سے وابستہ تھے جس کی بنیاد مذہب، معاشرت، سیاست، تہذیب وتمدن اور رسوم واقدار کے مروج ضابطوں کے خلاف ایک ہمہ گیر بغاوت پر تھی۔ اس تحریک سے وابستہ ادیب معاشرے کو بدل دینے اور زندگی کو آزاد دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان ادیبوں نے فن پارے کی تخلیق میں معاشرتی انقلابی اور طبقاتی شعور کو پیش نظر رکھا۔ یہ ادیب انصاف ومساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے تمنائی تھے۔

انجمن ترقی پسند مصنّفین کے مینی فیسٹو میں ادب کے لیے جو موضوعات تجویز کیے گئے اردو افسانہ ان سے اثر پذیر ہوا۔ اعلان نامے کے مطابق حیاتِ انسانی کے بنیادی مسائل کو ادب کا موضوع قرار دیا گیا اور اس کے ساتھ فرقہ پرستی، نسلی تعصّب، انسانی استحصال، جبر کی مخالفت، مذہب، جنس، جنگ اور معاشرے کے متعلق رجعت پسندی کی روک تھام اور توہم پرستی واضمحلال کی بجائے قوت، حرکت اور توانائی کے رویوں کی ترغیب بھی ادب کے موضوعات قرار پائے۔ ترقی پسند نظریات نے ان رجحانات کو ہمہ گیر بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ادیبوں نے معاش، معاشرت، سیاست، مذہب، اخلاق، تہذیب وتاریخ، روایات واقدار، روحانیت، جذبات وجمالیات غرض زندگی کے ہر رُخ کو معاشی عوامل کے ساتھ متصل کر کے اس کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی۔ بالخصوص مزدوروں، کسانوں، کم اُجرت والے ملازموں اور خدمت کرنے والے طبقے کے مسائل کو پیش کیا۔ معاشی جبر کا شکار ان مظلوموں کی حالتِ زار، عائلی زندگی کی مشکلات، تنگ دستی، بدحالی اور نفسیاتی اُلجھنوں کی تصویر کشی کی گئی۔ علاوہ ازیں بالادست طبقوں (سرمایہ داروں تاجروں، زمینداروں) کی حریصانہ سرگرمیوں کو بے نقاب کیا گیا بنا بریں ہمہ مذہبی اجارہ داروں کی حیلہ سازیوں، ذات پات کے بندھن، ماضی پرستی، توہم پرستی کے مختلف مظاہر اور ان کے مضر اثرات کو بھی افسانوں میں پیش کیا گیا۔ تمام موضوعات کو اپنا کر افسانہ نویسوں نے ادب برائے زندگی اور ادب برائے انقلاب کے ترقی پسند نعروں کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی۔ ان افسانہ نگاروں نے اپنے فن پاروں میں معاشی جبر کا شکار ایک ٹوٹتے سماج اور بغاوت کی تصویر کشی کی وہیں اور افسانہ نگاروں نے افسانوں میں عصری حسیت پیدا کی۔

اردو افسانے کی تاریخ میں انگارے کی اشاعت اور ضبطی ایک اہم واقعہ ہے۔ ''انگارے'' ان

چند نوجوانوں کی تخلیقات کا مجموعہ تھا جنہوں نے یورپ میں تعلیم حاصل کی تھی، جنہوں نے نئی زندگی کے انوکھے رنگ ڈھنگ دیکھے تھے۔ جنہوں نے یورپ سے اُٹھنے والی تحریکوں کو دیکھا، ادب کا مطالعہ کیا تھا۔ مختلف خیالات ونظریات کے حامل لوگوں سے ملاقاتیں کیں تھیں۔ چنانچہ وہ نئے عہد کی روشنی سے آگاہ تھے۔ سجاد ظہیر ۱۹۲۸ء میں آکسفورڈ یونی ورسٹی پہنچے تو ان کی ملاقات ہندوستان کمیونسٹ ممبر پارلیمنٹ مسٹر سکتا والا سے ہوئی۔ وہیں محمود الظفر، ڈاکٹر زین الدین اور دیگر لوگوں سے بھی ملے، چنانچہ سوشلسٹ نظریات اور روشن خیالی نے انہیں پرانی تحریکوں کے انہدام کی جانب راغب کیا اور جب وہ ہندوستان آئے تو انہوں نے محمود الظفر، رشید جہاں اور احمد علی کے تعاون سے ۱۹۳۲ء کے آخر میں ایک افسانوی مجموعہ شائع کرایا۔ اس مجموعے میں سجاد ظہیر کے پانچ افسانے (نیند نہیں آتی، جنت کی بشارت، دُلاری، پھر یہ ہنگامہ، گرمیوں کی ایک رات) احمد علی کے دو افسانے (بادل نہیں آتے، مہاوٹوں کی ایک رات) ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ دلی کی سیر اور ایک ڈرامہ پردے کے پیچھے) محمود الظفر کا (جوادی مردی) شامل تھے۔ ان مصنّفین نے جنس، عورت، نچلے طبقے کی زندگی کے مسائل، معاشرتی ناہمواریوں، برطانوی استعمار، طوائف کی زندگی کو موضوع بنایا۔ ۱۳۴ صفحات پر مشتمل یہ افسانوی مجموعہ روایت پرستوں کے لیے ایک چیلنج بن گیا۔ انگارے کی آمد سے جتنا شور بلند ہوا اس سے زیادہ تنقید سامنے آئی۔ چنانچہ اس کی اشاعت کو فحش قرار دینے کے ساتھ ساتھ اس کے خلاف ردِعمل بھی شروع ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ''انگارے کے بیش تر افسانوں میں سنجیدگی ومتانت کی بجائے سماجی رجعت پسندی اور دقیانوسیت کے خلاف غصہ اور ہیجان زور آور تھا۔''(۹) ڈاکٹر انور سدید لکھتے ہیں کہ کتاب محض ایک تجربہ تھی، اس میں زندہ رہنے کی قوت نہیں تھی مگر اس کی ضبطی نے اسے مقبول بنا دیا۔(۱۰) انگارے کو اپنی اشاعت کے چار ماہ بعد ہی مارچ ۱۹۳۳ء میں حکومت نے ضبط کر لیا۔ عزیز احمد انگارے کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> ''اس کتاب میں ہزار نقائص سہی لیکن اس کی اہمیت سے انکار نہیں۔ اس کی اشاعت سے نئے ادب نے خودمختاری کا علم بلند کیا۔ یہ سماج پر پہلا وحشیانہ حملہ تھا اور اگرچہ اس حملے میں غیر ضروری خون ریزی بھی بہت تھی۔''(۱۱)

بہر حال ابھی یہ ہنگامہ فرو نہیں ہوا تھا کہ پروفیسر احمد علی نے ''شعلے'' کے نام سے ایک اور افسانوی مجموعہ شائع کر دیا۔ مگر اسے وہ شہرت حاصل نہ ہوئی جو ''انگارے'' کے حصے میں آئی۔ انگارے کے افسانوں نے اردو ادب کو تکنیک کی متنوع جہات سے روشناس کرایا۔ اس مجموعے نے اُردو افسانے کے

ضمن میں ایک نئی روایت قائم کی جس نے ترقی پسند افسانے کو تقویت پہنچائی، سجاد ظہیر انگارے گروپ میں مرکزی حیثیت کے حامل تھے۔ انہوں نے نچلے متوسط طبقے کے افراد کی نفسی واردات کو شعور کی رَو کی تکنیک میں بیان کرنے کی کوشش کی اور تکنیکی اعتبار سے نئے جہان کو روشن کیا۔ انہوں نے تکنیک کے متنوع تجربات کر کے افسانے کو پُر ثروت کیا۔ ''انگارے'' میں شامل واحد خاتون افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں تھیں۔ اگر اس افسانے کا ''انگارے'' میں شامل دیگر افسانوں سے موازنہ کیا جائے تو یہ مختصر ترین افسانہ موضوعی یا فنی اعتبار سے کسی اہمیت کا احساس نہیں دلاتا۔ موضوعِ عام زندگی سے تعلق رکھتا ہے جس میں عورت کی بیچارگی اور بے بسی کا بیان ہے۔ نیز ہندوستان کی جنسی زندگی کی کٹھن اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کا عکس پیش کیا گیا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی زندگی میں پابندیاں، پردہ اور جہالت مل کر کس قسم کے ماحول کو جنم دیتی ہے۔ وہ ماحول اس افسانے میں موجود ہے۔(۱۲)

''انگارے'' میں شامل دوسری توانا آواز پروفیسر احمد علی کی تھی ان کے اس مجموعے میں دو افسانے شامل تھے یہ افسانے قدیم اور جدید رجحانات کے مابین سنگِ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ احمد علی ''انگارے'' کے دیگر افسانہ نگاروں کی مانند مغرب سے کسبِ فیض کرنے والوں میں سے تھے۔ ان کے افسانوں میں مغربی طرزِ بیان اور مختلف تحریکوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں یہ اُردو افسانے کو مغربی افسانے کے برابر لانا چاہتے تھے۔ چنانچہ احمد علی کا شمار ان افراد میں ہوتا ہے۔ جنہوں نے افسانے کی ابتدا میں ہی اسے جدید عالمی افسانے کے برابر لانے کی کوشش کی۔ ممتاز شیریں کے خیال میں احمد علی نے آزاد خیالی کو سریلزم کے ذریعے پیش کیا۔ احمد علی نے نئی تکنیک میں افسانہ لکھا جہاں تینوں زمانے ماضی، حال اور مستقبل ایک ساتھ وارد ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں انہوں نے شعور کی رو کی تکنیک کو استعمال کیا، احمد علی کے افسانوں میں آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک استعمال ہوئی۔ احمد علی کا ایک افسانوی مجموعہ ''شعلے'' منظرِ عام پر آیا لیکن اسے انگارے جتنی پذیرائی نہ مل سکی۔ اگرچہ ''شعلے'' میں شامل افسانوں میں پریم چند کی روایت نمایاں دکھائی دیتی ہے۔ ''ہماری گلی، تصویر کے دو رُخ'' میں واقعہ نگاری اور حقیقت نگاری کا اظہار نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی، احمد علی کے فن اور اسلوب کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''انگارے بُجھا دیے گئے لیکن اس کے فوراً ہی بعد انہیں خیالات نے شعلے کا بھیس بدل لیا۔ ان افسانوں میں اگرچہ احمد علی سے انہیں خیالات کو پیش کیا ہے لیکن قدرے ہلکے انداز میں۔''(۱۳)

ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے ''احمد علی نے کم لکھا لیکن وہ اردو افسانے میں ایک تاریخی شخصیت

شمار ہوتے ہیں۔(۱۴) محمود الظفر کا افسانہ ''جواں مردی'' انگارے میں شامل تھا یہ افسانہ اقتصادی محرومیوں اور نارسائیوں کو منظرِ عام پر لاتا ہے:

اردو افسانے کی تاریخ میں کرشن چندر کا نام نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ اپنی تخلیقات کے ذریعے انہوں نے ترقی پسند تحریک کو نہ صرف مستحکم کیا بلکہ ترقی پسند روایات کو آگے بڑھایا کرشن چندر کے افسانوں میں دو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں ایک تو ان کا مخصوص انداز کا حامل دل کش اسلوب ہے اور دوسری بات یہ کہ انہوں نے اردو افسانے میں بہت سے تجربات کیے۔ کرشن چندر کے اسلوب کے متعلق ڈاکٹر محمد صادق لکھتے ہیں:

''کرشن چندر کی تحریروں کی سب سے زیادہ خصوصیت ان کا کبھی نہ تھکنے والا اور تھکانے والا انداز ہے۔ اُن کے پاس ہر بات کے کہنے کا ایک ایسا طریقہ ہے جو سیدھا دل میں اثر کرتا ہے۔''(۱۵)

کرشن چندر فطرت کے خوبصورت مناظر بالخصوص کشمیر کی فضا اس کے قدرتی مناظر اور ماحول کو خوبصورت الفاظ میں پیش کرتے ہیں کرشن چندر کے افسانوں میں فطرت کے خوبصورت مناظر، صورت کا حسن اور جمالیاتی حُسن اور سرمایہ دارانہ نظام پر طنز، بنگال کا قحط، کسان اور مزدور کا استحصال اور شہری زندگی کو جزئیات سمیت پیش کیا۔ کرشن چندر نے بیک وقت رومان اور انقلاب کو افسانوں میں پیش کیا'' کرشن چندر کے افسانوں کا موضوع انسانی زندگی رہا ہے۔ انسانی زندگی کو مختلف زاویوں سے وسیع ترین تناظر میں دیکھنے کی جو کوشش ان کے یہاں ملتی ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ ترقی پسند ادیبوں میں مقبول ادیب تھے۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

''تمام ترقی پسند ادیبوں میں کسی کا نام اس قدر توصیف اور عزت کا مستحق نہیں جتنا کرشن چندر کا ہے۔ اس کی وجہ ان کی بے لوث اور با خلوص انسانیت ہے جو ان کی ہر تحریر سے مترشح ہے۔ اسی پر ان کے تخیّل اور ان کے فن کے بنیاد ہے۔ اس انسانیت کی وجہ سے ان کی ترقی پسندی کبھی دل آزادی نہیں کرتی، وہ دلوں میں اُتر کر اپنا کام کر جاتی ہے۔ سب کو متاثر کرتی ہے لیکن کسی کا دل نہیں دکھاتی، یہ خصوصیت ترقی پسند ادیبوں میں شاید ہی کسی اور میں پائی جاتی ہو۔ یہ ایک خداداد نعمت ہے۔ ایک طرح کی بے غرض نفسیاتی کیفیت ہے۔''(۱۶)

اُردو افسانے کو نئی سمت عطا کرنے والوں میں راجندر سنگھ بیدی کا نام بھی شامل ہے۔ بیدی نے اُردو ادب کو کئی خوبصورت افسانے دیئے بیدی کا تعلق پنجاب کے سکھ گھرانے سے تھا۔ انہوں نے

نچلے اور متوسط طبقے کے افراد کو افسانوں کا موضوع بنایا یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں دکھائی دیتی ہیں۔ بیدی کا عمیق مشاہدہ اور وسیع مطالعہ ان کے افسانوں میں نظر آتا ہے بیدی کے فن اور فکر میں گہرائی موجود ہے۔ان کے بیش تر افسانے حقیقی زندگی پر مبنی ہوتے ہیں وہ کسی بھی واقعہ کو من وعن بیان کرنے کی بجائے حقیقت میں تخیّل کا رنگ شامل کر دیتے ہیں۔ بیدی زندگی کے تلخ ترین واقعات کو بھی مہارت سے پیش کرتے ہیں ان کے افسانوی کردارِ زندگی کے پریشان کُن حالات میں بھی مسکرانے کا ہنر جانتے ہیں۔''بیدی کے افسانوں میں زندگی کی تلخی اور اس کی مصیبتوں کے ساتھ تھوڑا سا وہ لطف بھی ہے جو ان مصائب میں ہلکی سی روشنی پیدا کرتا ہے۔ یہ لطف محبت اور ہمدردی کا ہے۔اس کی وجہ سے ہی ہندوستان کے نچلے متوسط طبقے، مزدور اور کسانوں کی زندگی قابلِ برداشت ہے۔(۱۷)

عصمت چغتائی وہ پہلی افسانہ نگار خاتون ہیں جنہوں نے نہایت بے باکی کے ساتھ متوسط مسلم گھرانے کی زندگی اور ان کے مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔عصمت کے ابتدائی دور کے افسانوں میں جھنجھلاہٹ اور بغاوت کا عنصر نمایاں نظر آتا ہے۔انہوں نے اپنے افسانوں میں فرد کو بغاوت پر اُکسایا، وہ معاشرتی زندگی کے بعض پہلوؤں پر گہرا طنز کرتی ہیں۔عصمت چغتائی کے ہاں جنس اور جنسی مسائل اہم ترین موضوع ہیں۔انہوں نے عورتوں کے مسائل، ان کے جذبات اور ان کی نفسیات کو بے باکی سے بیان کیا۔ جو اردو افسانے میں ایک نئی چیز تھی۔ان کی شہرت کا باعث افسانہ''لحاف'' تھا جس میں نسائی جنس پرستی کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانے کی اشاعت نے انہیں اپنے دور کی متنازعہ شخصیت بنا دیا۔اُن پر منٹو کی طرح فحاشی کے الزامات لگے مقدمے چلائے گئے عزیز احمد نے انہیں رجعت پسندانہ اور مریضانہ رجحان کی افسانہ نگار کہا ہے۔عصمت چغتائی نے اپنے افسانوں کے ذریعے ہندوستانی معاشرے کی تصنّع، ریاکاری، قدامت پرستی، ہندوستانی عورت کی نفسیات، عنفوانِ شباب کی کرب انگیز لذتوں اور ہندوستانی معاشرتی بُرائیوں کو پیش کیا۔عصمت چغتائی کے افسانوی اُسلوب میں جوشیلا پن ہے انہوں نے اس دور کے تہذیبی رویوں سے برملا انحراف کیا۔ان کے اس نوع کے افسانوں میں''گیندا، فسادی، لحاف، پردے کے پیچھے، بہو بیٹیاں، بے کار، چوتھی کا جوڑا شامل ہیں۔عصمت چغتائی بہت بے ساختگی سے اپنے معاشرتی رویوں پر طنز کرتی ہیں۔ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی رقم طراز ہیں:

''عصمت کی نثر اپنے اندر بے ساختگی اور تیکھے پن کے علاوہ ایک تخلیقی جوہر رکھتی ہے۔۔۔ ان کے افسانوں سے اردو افسانوں کی لغت میں بے شمار نئے الفاظ، نئے محاورات اور نئی

تشبیہات وعلامات کا اضافہ ہوا ہے جو محض عورتوں کی معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔"(۱۸)

عصمت کے اسلوب میں ایک جوشیلا پن ہے وہ معاشرتی برائیوں، نسائی جذبوں کو اور دیگر فاسد مواد کو بغیر کسی رعایت کے چھیڑتی ہیں۔ سید وقار عظیم کا خیال ہے:

"حق کے اظہار کے لیے انہوں نے بہت سے لطیف اور شدید حربوں سے کام لیا ہے۔ تیکھے طنز، چست فقرے، شکر میں لپٹی ہوئی کڑوی باتیں، ہنسی مذاق، اور اسی ہنسی مذاق میں ہجو، پھبتیاں، باتوں کی چٹکیاں، ہنس ہنس کر سب کچھ کہہ جانا، یہ سب سیدھی سادی روزمرہ کی باتیں، ان کے فن کے تھوڑے سے حربے ہیں۔"(۱۹)

حیات اللہ انصاری ترقی پسند تحریک کے اہم ستون مانے جاتے ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کی سرگرمیوں میں بڑے جوش وخروش سے حصہ لیا۔ ان کے افسانوں کا اساسی موضوع ہندوستان کی سماجی پستی اور معاشی بدحالی ہے انہوں نے طبقاتی تضاد کو حقیقت نگاری سے آشکار کیا۔ انہوں نے انوکھی مصیبت، ڈھائی سیر آٹا، کارخانہ میں درد وکرب اور بے رحم حقیقت کو پیش کیا۔ حیات اللہ انصاری کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے جزئیات سے کام لے کر ہر چیز کے باطن تک رسائی حاصل کی۔ حیات اللہ انصاری زبان وبیان کے لحاظ سے بھی کامیاب افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے سادہ اور دل کش زبان میں اپنا مدعا بیان کیا۔ وہ بڑی سے بڑی اور پیچیدہ سے پیچیدہ بات بآسانی کہہ دیتے ہیں انہوں نے ہندوستانی معاشرے کا گہرا مشاہدہ کیا اور پھر نہایت جزئیات کے ساتھ اس معاشرے کی پرتوں کو کھول کر قارئین کے سامنے رکھ دیا۔

پریم چند کے اصلاحی رجحان کو فروغ دینے والوں میں علی عباس حسینی کا نام الگ شناخت رکھتا ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی سماجی زندگی کو بڑی خوبی سے افسانوں میں پیش کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے کسانوں اور مزدوروں کی مفلسی، لاچاری، ساہوکاروں اور زمینداروں کے ظلم وستم، بے سہارا افراد کی زندگی اور ان کی نفسیات کی ترجمان کی انہوں نے گاؤں کی پُر لطف زندگی کو دل کش پیرائے میں پیش کیا۔ علی عباس حسینی نے ترقی پسند تحریک کی پہلی کل ہند کانفرنس میں جوش وخروش سے حصہ لیا۔ چونکہ وہ سرکاری ملازم تھے اور سرکاری احکامات کی وجہ سے انہوں نے اس تحریک سے عملی وابستگی کچھ کم کردی تھی۔ علی سردار جعفری ترقی پسند ادب میں لکھتے ہیں:

"ایک اچھے افسانہ نگار کو بڑا افسانہ نگار بننے سے جس چیز نے روکا ہے وہ شاید ان کی نیم سرکاری

ملازمت ہے جس کے قیود کی مجبوراً پابندی کرنی پڑتی ہے اور میں نے محسوس کیا ہے کہ۔۔۔جو کچھ وہ لکھنا چاہتے تھے نہیں لکھ سکے۔"(۲۰)

روایت سے بغاوت کرنے والوں میں ایک اہم نام "سعادت حسن منٹو" کا ہے۔ "جنس نگاری" منٹو کا خاص موضوع ہے۔ اس جنس کا مقصد عریانی یا فحاشی پھیلانا نہیں بلکہ اس کے پیچھے ایک صحت مند نفسیاتی نظریہ کارفرما نظر آتا ہے۔ منٹو انسانی باطن میں پوشیدہ غلاظتوں کو اپنے افسانوں میں دکھاتے ہیں۔ منٹو کے اس نوع کے افسانوں میں "ٹھنڈا گوشت، بو، ہتک، بابو گوپی ناتھ، کالی شلوار اور جانکی شامل ہیں۔ منٹو نے ایک ذمہ دار ادیب کا فرض نبھاتے ہوئے ان معاشرتی ناسوروں کے علاج کی کوشش کی جو ہمارے معاشرے کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے۔ جنس کو اردو ادب میں شجر ممنوعہ کی حیثیت حاصل ہے۔ درحقیقت زندگی کے اس اہم شعبے کو ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھا جاتا رہا۔ "ان کے افسانوں کو کبھی جنس پرستی، انحطاط اور فحش نگاری کا بدترین فعل قرار دیا گیا اور کبھی شعور اور لاشعور کی بھول بھلیوں میں بھٹکتے ہوئے بیمار ذہن کی پیداوار۔ کسی نے انہیں "غلاظت نگار" ٹھہرایا اور کسی نے زندگی کی گوناگوں فتنوں کو جرات مندی سے پیش کرنے والا سچا فنکار۔(۲۱)

منٹو کی موافقت میں بہت ہی کم اور مخالفت میں بہت ہی زیادہ لکھا گیا۔ بلکہ ایک زمانہ تک انہیں اردو کا بدنام ترین افسانہ نگار کہا جاتا رہا اور منٹو کی بعض تحریروں کو بنیاد بنا کر ترقی پسند تحریک پر اعتراضات اور تنقید کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ منٹو اپنی تخلیقات کے ذریعے فرسودہ معاشرتی نظام کی خرابیوں کو نمایاں کر کے اسے تبدیل کر دینے پر زور دیتے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے خوبصورت واقعات اور حسن و عشق کے دل کش مناظر کی بجائے زندگی کی ٹھوس اور کڑوی حقیقتوں کو پیش کیا۔ منٹو کے افسانوی کرداروں میں ایسے افراد بھی شامل ہیں جو وقت کے تھپیڑوں کا شکار ہیں اور معاشرے کے اہم فرد ہونے کے باوجود ان کو پست سمجھا جاتا ہے اور حقیر نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے۔ منٹو حقیقت کا ترجمان ہے وہ نہ صرف کرداروں کے ذریعے حقیقت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ماحول بھی ایسا پیش کرتا ہے کہ افسانوی کردار بھی جیتے جاگتے اور چلتے پھرتے انسان معلوم ہوتے ہیں۔ منٹو نے اپنے کئی افسانوں میں "طوائف" کے کردار کو پیش کیا۔ منٹو کے بعض افسانوں کو بے باکی اور فحاشی کی مثال قرار دیا گیا۔ کئی افسانوں پر مقدمے بھی چلے۔ منٹو ایسے غلط سماجی نظام کو ختم کرنا چاہتے ہیں جو انسان کو ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف لے جائے۔ منٹو ایک حساس اور باریک مشاہدے کے افسانہ نگار تھے ان کے افسانوں کے مطالعے کے لیے قاری کے ذہن کا تربیت یافتہ

ہونا انتہائی ضروری ہے محمد حسن عسکری نے منٹو کو اردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار کہا ہے۔

اوپندر ناتھ اشک نے ہندوستان کی سماجی زندگی، دیہاتی زندگی، چھوٹے چھوٹے گاؤں، کھیت کھلیان، دیہاتی معصوم اور سادہ لوح افراد کی ترجمانی کی۔ اشک نے اپنے افسانوں میں نچلے متوسط طبقے کی محرومیوں اور نارسائیوں کو حقیقی پیرائے میں پیش کیا۔ انہوں نے نچلے متوسط طبقے کی گھریلو زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ اشک کے اس نوع کے افسانوں میں ''کھلونے، بے بس، بیگن کا پودا'' شامل ہیں۔ انہوں نے ''کونپل، قفس، چٹان، ڈاچی اور پلنگ'' جیسے افسانوی مجموعوں میں زندگی کی سچائیوں کو کامیابی سے پیش کیا۔

احمد ندیم قاسمی کا شمار ترقی پسند تحریک کے اُن افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جن کی انفرادیت قائم ہے آپ ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن رہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کے ذریعے ترقی پسند ادب میں خاطر خواہ اضافے کیے۔ انہوں نے اپنا موضوع دیہی زندگی کو بنایا اور پنجاب کی دیہاتی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کیں۔ انہوں نے پنجاب کی دیہاتی زندگی کو نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ پُر اثر انداز میں پیش کیا۔ زمینداروں اور جاگیرداروں کی حکمرانی، مزدوروں، کسانوں اور بے سہارا افراد کی مفلسی، بدحالی، جہالت اور پسماندہ طبقے کے استحصال کو حقیقی روپ میں پیش کیا۔ لیکن ان سب امور کے بیان میں وہ افسانے کے فنی طور طریقوں کو بھی قائم رکھتے ہیں انہوں نے دیہاتی زندگی کی سچی اور ٹھوس حقیقتوں کو فنکارانہ بلندیوں کے ساتھ پیش کیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ جس طرح انہوں نے دیہاتی زندگی کا مطالعہ مشاہدہ جتنے قریب سے کیا شہری زندگی کی حقیقتوں کو اتنے شعور سے پیش کرنے میں وہ کامیابی نظر نہیں آتی جو دیہی زندگی میں دکھائی دیتی ہے احمد ندیم قاسمی پنجابی تہذیب کے ترجمان ہیں۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں:

> ''احمد ندیم قاسمی زندگی کے ایک زیرک ناظر ہیں اور ان کا فن زندگی کے ارضی پہلوؤں کا ایک خوبصورت عکس پیش کرتا ہے لیکن خوبی کی بات یہ ہے کہ ان کے یہاں تخیّل کی لطافت، رفعت اور ملائمت بھی ہمہ وقت قائم رہتی ہے۔''(۲۲)

احمد ندیم قاسمی نے دیہی زندگی کے مسائل کے علاوہ تہذیبی اور سماجی موضوعات پر بھی لکھا۔ قاسمی زندگی کے کھوکھلے پن اور داخلی تضادات کو بھی پیش کرتے ہیں ان کے اسلوب میں شعریت کا امتزاج بھی ملتا ہے۔ قاسمی نے اردو ادب کو کئی خوبصورت افسانے دیئے ان میں بابا نور، بین، میں انسان ہوں،

کفن دفن، موچی، ماتم، پرمیشر سنگھ، رئیس خانہ، شامل ہیں۔ قاسمی نے پنجاب کے دیہاتی مسائل کو کہانی کا روپ دیا''احمد ندیم قاسمی پنجاب کی زندگی کے عکاس بن کر اُبھرے۔ چوپال اور بگولے ان کے ایسے افسانوی مجموعے ہیں جن میں پنجابی زندگی کے خدوخال اُبھر آئے ہیں۔ (۲۳)

ترقی پسند تحریک کا ایک اہم نام خواجہ احمد عباس بھی ہے۔ یہ اردو کے ایسے افسانہ نگار ہیں، جن کے فن پر مارکسی نظریے کی لے کافی تیز دکھائی دیتی ہے۔ خواجہ احمد عباس افسانہ نگار، ناول نویس، صحافی اور فلمی کہانیاں لکھنے والے تھے۔ اس لیے ان کے بیش تر افسانوں پر صحافت غالب نظر آتی ہے۔ ترقی پسند تحریک سے انہیں جذباتی لگاؤ تھا اس تحریک سے انہوں نے بہت کچھ حاصل کیا اور بہت شہرت پائی۔ خواجہ احمد عباس نے اپنے افسانوں میں سماج کے دبے کچلے، بے بس مجبور عوام کی کہانی لکھی۔ علاوہ ازیں سماج کے ٹھیکیداروں، کارخانوں کے مالکوں اور ظالم طبقے کی اصلیت کو کہانیوں میں آشکار کیا۔ علاوہ ازیں معاشرے کی فرسودہ رسم ورواج اور ناانصافیوں کی کھل کر مخالفت کی۔ ان کے مشہور افسانوں میں''ابابیل، رادھا، اختیار، سردار جی، اُتار چڑھاؤ، آسمانی تلوار، تین عورتیں شامل ہیں۔ خواجہ احمد عباس اردو کے منفرد افسانہ نگار ہیں۔ جن کی کہانیوں میں عام انسانوں کی خوشیاں، ان کے دکھ درد، ان کے خواب نظر آتے ہیں۔ ترقی پسند تحریک کے فروغ میں ان کا کردار بہت اہم ہے۔ (۲۴)

اختر اورینوی نے صوبہ بہار کی دیہاتی زندگی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ان کا پسندیدہ موضوع دیہی زندگی کی تصویر کشی ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں سماج کی تلخ حقیقتوں کو فن کارانہ جرأت مندی سے پیش کیا۔ انہوں نے حقیقت نگاری کی راہ لی اور اپنے افسانوی کرداروں کے ذریعہ زمانے کی تلخ حقیقتوں پر بھرپور طنز کیا۔ انہوں نے اپنے افسانوی مجموعوں، کلیاں اور کانٹے، انارکلی، بھول بھلیاں، سینٹ، میں نچلے طبقے کی معاشی مشکلات، انسانی قدروں اور بھوک کا تصادم، قرض اور سود، لڑائی جھگڑے مقدمہ بازی، زمینداروں کے مسائل اور کچلے ہوئے محروم طبقے کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے۔

دیوندر ستیارتھی نے اپنی زندگی کا بیش تر حصہ ہندوستان اور دیگر ممالک کی سیر وتفریح میں گزارا۔ چنانچہ انہوں نے مختلف جگہوں سے لوک گیت اکٹھے کیے اور انہیں کو بنیاد بنا کر افسانے لکھے۔ میں ہوں خانہ بدوش، نئے دیوتا اور بانسری بجتی رہی، دیا جلے ساری رات، لال دھرتی اور نئے دھان سے پہلے، مجموعوں میں زندگی کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے عوامی زندگی کو دل کش پیرائے میں پیش کیا۔ ستیارتھی کی تحریر دل کش ہے۔ گیتوں کے ذریعے انہوں نے اپنے افسانوں میں مزید نکھار پیدا

کیا۔ بہر حال ستیارتھی اپنی خاص طرز تحریر اور طرز ادا کے سبب ترقی پسند افسانہ نگاروں میں منفرد شخصیت کے مالک رہے۔ ستیارتھی کے افسانوں کے متعلق ڈاکٹر شہناز لکھتی ہیں ''ستیارتھی نے اپنے افسانوں میں عوام کی زندگی کی خوش حالی، محبت، شجاعت اور اخوت کا ذکر تو کیا ہی ہے ساتھ ہی ان کی مفلسی، غلامی اور دُکھ درد کو بھی سمویا ہے ان کے افسانوں میں ہمیں اس درد بھری دنیا میں بھی خلوص اور انسانیت کی مدد سے زندگی پر اعتماد قائم کرنے کا درس ملتا ہے۔''(۲۵)

سہیل عظیم آبادی نے صوبہ بہار کی دیہاتی زندگی کو سادگی سے پیش کیا۔ انہوں نے پریم چند کی روایت کو زندہ کیا اور دیہاتی زندگی کو محور بنا کر اپنے افسانوں میں پیش کیا۔ سہیل عظیم آبادی نے کسانوں کی دکھ بھری زندگی اور جدوجہد کو اپنے افسانوں میں فن کارانہ سلیقے سے پیش کیا۔ ''الاؤ، نئے اور پرانے'' اور ''تین تصویریں'' میں وہ زندگی کے ہمدرد مبصر نظر آتے ہیں۔ ''سہیل عظیم آبادی کے عام افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ قابلِ توجہ ہے وہ انسان پر اعتماد ہے وہ انسان سے کبھی مایوس نہیں ہوتے۔ اس نقطۂ نظر نے انہیں کلبیت اور تخریبی میلان سے بچا لیا اور ان کو وہ مثبت زاویہ نظر آیا جو انقلابی ہونے کے باوجود تعمیری ہے۔ مہندر ناتھ نے اشتراکیت پسند نظریات کو ادب میں پیش کیا۔ وہ مشہور ترقی پسند ادیب کرشن چندر کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں عوام کی غربت اور ان کے مسائل کو پیش کیا۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتیں اپنی تلخ ترین صورت میں نظر آتی ہیں۔ انہوں نے زندگی کے مسائل کو من وعن پیش کیا۔ مہندر ناتھ کا پسندیدہ موضوع جنس، جنسی مسائل اور خدمتِ خلق کا جذبہ ہے۔ انہوں نے بھوک، بیماری، بے کاری، مفلسی کو اپنے افسانوی مجموعوں میں پیش کیا۔

بلونت سنگھ نے شہری اور دیہاتی زندگی کی عکاسی کامیابی سے کی۔ انہوں نے پنجاب کے دیہاتوں کو قریب سے دیکھا، یہاں کے انسانوں کی بدحال زندگی، زمینداروں کا ظلم وستم، ان کے دُکھ اور درد کو افسانوں میں خوبی سے پیش کیا۔ دیہاتی زندگی کے ساتھ ساتھ شہری زندگی پر بھی افسانے لکھے انہوں نے متوسط طبقے کے مسائل پر روشنی ڈالی۔ ان کے افسانوں کی زبان سادہ اور آسان ہے۔ انہوں نے ''جگا، سمجھوتہ، دیمک، بیمار، خلا'' اور ''پنجاب کا البیلا'' میں زندگی کی حقیقتوں کو پیش کیا۔

قاضی عبدالستار نے جاگیردارانہ نظام کے زوال، بھوک، روٹی کے مسئلے، کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ ابتدا میں ان کا تعلق ترقی پسند تحریک سے تھا لیکن کچھ عرصہ بعد انجمنِ ترقی پسند مصنّفین عہدے داروں کی سازشوں اور مصلحت پسندی کے رویے سے تنگ آ کر ترقی پسند تحریک سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔

اختر حسین رائے پوری کے افسانوں میں بے زاری، تلخی اور زہر ناکی نمایاں ہے۔انہوں نے افسانوی کرداروں کے ذریعے زندگی کے دونوں پہلو خیر اور شر کو کامیابی سے پیش کیا۔''دل کا اندھیرا، جسم کی پکار، دیوان خانہ''اور'' کافرستان کی شہزادی'' جیسے افسانوں میں زوال آمادہ کرداروں کو حقیقت بیان سے پیش کیا۔عزیز احمد کے ہاں مغربی مطالعے کے اثرات نظر آتے ہیں ان کے افسانوں میں تاریخ، تحقیق، سیاحت اور سیاست کو جنسی رمزیت کے ساتھ ہم آہنگ کر کے قاری کی دل چسپی کا سامان پیدا کیا۔ان کا شمار جنسی رمزیت نگاروں میں ہوتا ہے۔ان کے افسانوں میں مصنف کا وسیع مطالعہ اور عمیق مشاہدہ جھلکتا ہے۔انہوں نے اساطیر اور تاریخ کو افسانے کے حوالے سے پیش کرنے کا تجربہ بھی کیا۔عزیز احمد نے اردو افسانے کو نئے موضوعات اور اسالیب سے متعارف کرایا۔ان کے افسانوی مجموعے'' بے کار دن بے کار راتیں'' اور'' رقصِ نا تمام'' میں جہاں جنس کا بے کانہ اظہار ملتا ہے وہیں مستقبل کی طرف لپکنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔

ہنس راج رہبر نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا انہوں نے معصوم دیہی افراد کی زندگیوں کی عکاسی کی۔انھوں نے دیہی افراد کی سادگی کو حقیقت نگاری کے پیرائے میں پیش کیا۔ان کے افسانوں میں گڈ ولتا، راجارام، نیا اُفق، ادب اور تب، گوروکی نگری، کبیر کی بانی، لائقِ توجہ ہیں۔خدیجہ مستور ترقی پسند افسانہ نگاروں میں نمایاں حیثیت کی حامل ہیں۔ان کے ابتدائی افسانوں میں نوجوان کے رومانی جذبات کی عکاسی ملتی ہے وہیں کہیں کہیں سماجی حقیقت نگاری کے نمونے اور ترقی پسند تحریک سے تعلق رکھنے والے ادیبوں کے مخصوص منشور کی جھلک بھی نظر آتی ہے خدیجہ مستور کے افسانوں میں محنت کش طبقہ کی ناگفتہ بہ حالت، دولت کی غیر مساوی تقسیم، سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیاں، جنگِ عظیم کے اثرات، فسادات، فسادات کے موقع پر انسانیت کے پُرسوز مناظر اور مغویہ عورتوں کی عصمت دری کی جھلک دکھائی دیتی ہے انہوں نے نسائی زندگی کے مسائل پر بھی لکھا۔عورت کا جنسی، جذباتی اور جسمانی استعمال خدیجہ مستور کا اہم موضوع ہے۔

ہاجرہ مسرور کا شمار بھی ترقی پسندوں کے گروہ میں ہوتا ہے۔ان کے ابتدائی دور کے افسانوں میں عصمت چغتائی کے اثرات نظر آتے ہیں۔اس دور میں جنس ان کا اہم موضوع رہا لیکن کچھ عرصہ بعد نسائی زندگی کی مشکلات اور متوسط طبقے کی معاشی حالت ان کے پیشِ نظر رہی۔ان کے ابتدائی افسانے جذباتیت سے بھرپور ہیں تاہم قیامِ پاکستان کے بعد اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔انہوں نے خارجی

مسائل کے ساتھ ساتھ گھریلو زندگی کی مشکلات، ازدواجی تعلقات، عورت کی نفسی و باطنی کیفیات، مردوزن کی جنسی ضرورتوں، ہندو مسلم منافرت، فسادات، سرمایہ دارانہ نظام کے استحصالی رویے، معاشی تفاوت اور سیاسی معاملات و مسائل کو احاطہ تحریر میں لائیں۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی نے زندگی کے بعض اہم مسائل پر قلم اُٹھایا۔ ان کے افسانوں کی فضا گمبھیر اور سنجیدہ ہے۔ ان کے افسانے روپ چند، بھنور، بہو بازار، گل دان کے پھول، توجہ طلب ہیں۔ شکیلہ اختر کا طرزِ نگارش دل کش ہے۔ رضیہ سجاد ظہیر کے افسانوں میں حقیقت نگاری کا عنصر نمایاں ہے۔ ان کی کہانیاں ''نیلی گٹھری'' اور ''منہ بولا بیٹا'' میں نمایاں ہیں۔ سرلا دیوی کی کامیاب کہانیوں میں کلنک، جوالا مکھی اور ''دیا بجھ گیا'' شامل ہے۔ پریم ناتھ پردیسی نے کشمیر کی زندگی کو افسانوں کا موضوع بنایا۔ ''آنسو اور جھری، بہے چراغ، ایک پیسہ'' ان کی کامیاب کہانیاں ہیں۔ اختر جمال کے افسانوں میں سماجی اقتدار کا انہدام، معاشرتی تفاوت، سیاسی جبر واستبداد، ظلم و جبر کی عکاسی ملتی ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی تلخ اور مکروہ حقیقتوں کو افسانوی رنگ میں پیش کیا۔ انہوں نے قیامِ پاکستان کے بعد ٹوٹتے بکھرتے خوابوں اور مشرقی پاکستان کے المیے کو بطورِ خاص موضوع بنایا۔ ترقی پسند تحریک متذکرہ بالا افسانہ نگاروں کے افسانوں اور افسانوی مجموعوں سے عبارت ہے جن کی اہمیت وافادیت سے انکار ممکن نہیں۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی وہ پہلی تحریک تھی جس کے لیے ایک باضابطہ منشور تحریر کیا گیا۔ اس کا مقصد بقول سجاد ظہیر یہ تھا کہ افراد ادبی مسائل پر اظہارِ خیال کریں۔ معاشرتی عوامل اور کیفیات کا تجزیہ کریں۔ ادب کو محنت کش طبقہ کی زندگی کو بہتر بنانے کا ذریعہ خیال کیا جائے۔ ایسا ادب تخلیق کیا جائے جو عوام کے دُکھ سُکھ اور جدوجہد کی عکاسی کر کے اسے روشن مستقبل کی نوید دلائے۔ علاوہ ازیں زندگی کے بنیادی مسائل مثلاً بھوک، مفلسی، معاشرتی غلامی، طبقاتی کش مکش کو موضوع بنایا جائے۔ غرض ادیبوں نے ادب کو جادوئی اور فرضی دنیا سے نکال کر زندگی سے ہم آہنگ کیا۔ افسانہ نگاروں نے انسانوں کے دُکھ درد، محرومیوں، ناکامیوں کا اظہارِ تخلیقی کاوشوں کے ذریعے کیا۔ وہ سماجی اور معاشی انقلاب کے ذریعے انسان کے انفرادی دکھوں اور اجتماعی مسائل کو حل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے فرد سے زیادہ معاشرے کی اہمیت تھی۔ ان قلم کاروں کی تخلیقات کا مقصد یہی تھا کہ دل کی بات دل سے نکلے اور دل پر اثر کرے۔ غرض ترقی پسند تحریک اردو ادب کی صحت مند تحریک تھی جس نے افسانے کو مختلف اصناف اور موضوعات سے روشناس کیا۔ اس تحریک کے زیرِ اثر افسانے میں نت نئے تجربے ہوئے اور افسانے میں بین الاقوامی

مسائل جگہ پانے لگے۔

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی ایک توانا تحریک تھی جس نے اردو ادب بالخصوص افسانے اور شاعری پر اَن مٹ نقوش ثبت کیے۔ ترقی پسند تحریک سے باہر بھی افسانہ نگاروں نے اپنی شاہکار تخلیقات کی بدولت دنیائے افسانہ میں خوبصورت افسانے کیے۔ ان میں غلام عباس، ممتاز مفتی، امجد الطاف، فیاض محمود، ابوالفضل صدیقی، عاشق حسین بٹالوی، آغا بابر، شفیق الرحمان، قدرت اللہ شہاب، شمس آغا، مسعود شاہد، رفیق حسین، جمیلہ ہاشمی، بانو قدسیہ، اشفاق احمد، ابراہیم جلیس، رضیہ فصیح احمد، عفرا بخاری اور سائرہ ہاشمی کے نام اہم ہیں۔ غلام عباس معمولی کو غیر معمولی بنانے والے افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے انسانی نفسیات کے انوکھے گوشے آشکار کیے۔ ان کے افسانے زندگی کے دائروی عمل کو سادہ انداز میں پیش کرتے ہیں۔ انہوں نے طوائف کی زندگی، طوائفی معاشرے کی تشکیل، دبی دبی محبت، گھریلو خانگی زندگی کو موضوع بنایا۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، غلام عباس کے افسانوں کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ''غلام عباس نے مسائلی افسانے نہیں لکھے۔ بلکہ ان انسانی صورتوں (Situations) کی کہانیاں لکھی ہیں جو آفاقی اور ابدی ہیں۔ اس لیے ان کے افسانے وقت کے ساتھ اپنی دلچسپی نہیں کھوتے بلکہ اسی طرح تروتازہ اور زندہ رہتے ہیں۔''(۲۷)

''آنندی'' جاڑے کی چاندنی، کن رس، دھنک، ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ممتاز مفتی کے افسانے فرد کی داخلی کتھا کو منظرِ عام پر لاتے ہیں، انہوں نے اپنے افسانوں میں انسانی نفسیات کی بوالعجبیوں کی ترجمانی کی۔ اس لیے انہیں لاشعور میں دبے مخفی جذبوں کی بازیافت کرنے والے افسانہ نگار کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کو ''ان دیکھی، گہما گہمی، چپ، اسمارائیں، گڑیا گھر، روغنی پتلے، میں کامیابی سے پیش کیا۔ محمد حسن عسکری نے انسان کی ناآسودہ آرزوؤں کو افسانے میں پیش کیا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''جزیرے'' اور ''قیامت ہم رکاب آئے نہ آئے'' میں کرداروں کی تحلیلِ نفسی کا انداز نمایاں ہے۔ ان کے افسانوں چائے کی پیالی، پھسلن اور حرام جادی معاشرے کے احتساب کی زد میں آئے لیکن ان سے اردو افسانے کی نئی روایت کو فروغ ملا۔ امجد الطاف کے افسانوں میں معاشرتی مسائل سے پیدا ہونے والی نفسیاتی کیفیات آشکار ہوتی ہیں۔ ان کے مجموعے ''کچے دھاگے'' کے افسانوں میں نیا انداز نظر آتا ہے۔ فیاض محمود نے پردہ دار گھروں میں پیدا ہونے والی محبّت اور دبی دبی محبّت پر افسانے لکھے، رنگ بو اور پھول اور کانٹے، میں محبّت کی میٹھی کسک پائی جاتی ہے۔ ابوالفضل

صدیقی دیہی زندگی کے حقیقت نگار ہیں۔ انہوں نے ''اہرام، جوالا مکھی، انصاف'' اور'' آئینہ'' میں دیہاتی ماحول اور دیہاتی داخلی سازشوں سے پردہ اُٹھایا ہے۔ محمد علی ردولوی نے افسانے میں قدیم اور جدید روایات کی بازیافت کی اور قصہ گوکو کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں۔ عاشق حسین بٹالوی ''سوزِ ناتمام'' کے افسانوں میں خواب کو حقیقت سے اور رومانیت کو واقعیت سے متصادم کراتے دکھائی دیتے ہیں۔ آغا بابر کے اپنے افسانوں میں اُدھیڑ عمر کے افراد کے جنسی جذبات کو موضوع بنایا ہے۔ ان کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور مقامی رنگ کا عکس نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر انور سدید کا خیال ہے:

''جنس کو مرد کے زاویے سے دیکھنے کا منفرد انداز آغا نے پیدا کیا۔ آغا بابر ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جو افسانے کے تار و پود کو بری چابک دستی سے بنتے ہیں اور اختتام پر قاری کے حواس پر چھا جاتے ہیں۔''(۲۸)

آغا بابر نے ''چاکِ گریباں، اڑن طشتریاں، لب گویا'' اور'' پھول کی کوئی قیمت نہیں'' میں محبت کے ارضی جذبے کو اہمیت دی۔ اعجاز حسین بٹالوی کے بیش تر افسانے قاری کے اردگرد گردش کرتے ہیں۔ شفیق الرحمان کے افسانوں میں حسن کی جلوہ افروزیاں اور عشق کی جاں گداز لذت موجود ہے۔ ''کرنیں، پرواز، شگوفے، لہریں، مدوجزر، حماقتیں، پچھتاوے'' میں اور'' مزید حماقتیں'' میں قاری کو رُوحانی مسرت عطا کرتے ہیں جو انسان کو زندہ رہنے کا حوصلہ عطا کرتے ہیں۔

قدرت اللہ شہاب کے بیش تر افسانوں کا خمیر کشمیر کی مٹی سے اُٹھا۔ ''نفسانے'' اور'' ماں جی'' کے افسانوں میں ماہر افسانہ نگار انسان کے داخل سے نیکی تلاش کرتے ہیں۔ ان کا لازوال کردار'' ماں جی'' خیر کا نمائندہ ہے۔ شمس آغا نے اوائل شباب کی رومانی تلخیوں سے افسانوں کی تلاش کی۔ ''سراب، خواب، فریب آرزو'' اور'' شکست'' ان کے شاہکار افسانے ہیں مسعود شاہد نے زندگی کے محاسن و مصائب پر افسانے لکھے اور عوامی شعور کو معاشرتی زندگی سے دریافت کیا۔ ''سُرخ مکان'' میں انہوں نے معاشرتی حقائق کی نقاب کشائی کی، رفیق حسین کے افسانوں میں جانور انسانی کرداروں کی طرح اپنا عمل حیات منظر پر لاتے اور معاشرتی اخلاق اور جنگل میں قانون کا احترام پیدا کرتے ہیں۔ اس نوع کے افسانوں میں ''کفارہ، کلوا، بیرو، گوری ہو گوری'' شامل ہیں۔

قرۃ العین حیدر نے اپنے مخصوص علمی نظریے اور منفرد اسلوب کی بدولت بہت جلد بحیثیت افسانہ نگار اپنی پہچان بنائی۔ قرۃ العین حیدر نے اپنا مخصوص اسلوب اپنایا جس میں زیادہ تر فارسی، انگریزی

اور دیگر زبانوں کے اثرات نمایاں ہیں۔قرۃ العین حیدر کے ابتدائی دور کے افسانوں میں بورژوا طبقے کی نمائندگی نظر آتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان کے افسانوں کے موضوعات میں تبدیلی پیدا ہوئی ان کے افسانوں میں مختلف تہذیبوں کا تقابل نظر آتا ہے انہوں نے تقسیمِ ہند کے نتائج، انسان کی نفسی و باطنی اُلجھنیں، اعلیٰ اقدار اور روایات میں تبدیلی پر لکھا۔قرۃ العین حیدر کے مقبول افسانوں ''ستاروں سے آگے، شیشے کا گھر، پت جھڑ کی آواز، رقصِ شرر، روشنی کی رفتار، ہاؤسنگ سوسائٹی، ستیاہرن، برف باری سے پہلے، جلاوطن، اگلے جنم موہے بٹیانہ کیجو'' شامل ہیں۔

الطاف فاطمہ نے حیاتِ انسانی کے مختلف معاملات و مسائل کو موضوع بنایا۔ان کے افسانوں میں اخلاقی و روحانی نظام کے زوال، بدلتی روایات اور اقدار اور جدید تہذیب کے پیدا شدہ مسائل ان کے ماضی کی بازیافت کا عمل بھی دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں میں عصری، سیاسی اور سماجی شعور کے عمدہ نمونے بھی ملتے ہیں۔

اشفاق احمد کے افسانوں میں تصوف کا واضح میلان دکھائی دیتا ہے۔ وہ مخصوص تہذیبی اور معاشرتی طبقات کی نمائندگی کرتے ہیں اشفاق احمد کے افسانوں میں محبّت نت نئے رنگوں میں جلوہ گر ہوتی ہے اس محبّت کی اصلی جولان گاہ گھریلو زندگی ہے وہ محبّت کے سوا زندگی میں ہر چیز کو بے معنی اور بے حقیقت گردانتے ہیں۔سید وقار عظیم لکھتے ہیں:

> ''گھریلو زندگی میں یوں تو انسان کی معاشرتی زندگی کے مختلف رشتے محبت کے اس وسیع مفہوم کے ترجمان ہیں لیکن محبت کا اصلی جوہر اس وقت کھلتا ہے جب بچے اس رشتے کے تاروں کو جوڑتے ہیں۔زندگی میں بچوں کا وجود محبت کی سب سے سچی اور سب سے مکمل تفسیر ہے۔ یہ اس محبت کی ایک سطح ہے جو ہمیں اشفاق احمد کے افسانوں میں دوسری چیزوں پر غالب اور حاوی نظر آتی ہے۔''(۲۹)

ممتاز شیریں کے دو افسانوی مجموعے ''اپنی نگریا'' اور ''میگھ ملہار'' میں ازدواجی زندگی اور اس کے متعلقات کو موضوع بنایا گیا ہے ان کے بعض افسانوں میں ترقی پسند تحریک کے اثرات نظر آتے ہیں اور ''کفارہ، میگھ ملہار'' میں اساطیری رجحان کا غلبہ نظر آتا ہے۔ ''کفارہ'' ممتاز شیریں کی آپ بیتی ہے جس میں انہوں نے اپنے ذاتی المیے کو اساطیری تلمیحات سے آمیز کر کے پیش کیا۔ بالآخر افسانہ نگار ممتاز شیریں پر ناقد ممتاز شیریں کے اثرات غالب نظر آتے ہیں۔

بانو قدسیہ کے افسانوں میں تصوف اور فلسفہ کا امتزاج نظر آتا ہے۔ بانو قدسیہ اپنے کرداروں کے ذریعے انسان کے روحانی و باطنی تجربات کی عمدہ ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے افسانوی کردار متصوفانہ نکات اور اسرار و رموز سمجھانے کے ماہر ہیں انہوں نے ہم جنس عورت کی زندگی کے بہت سے پہلوؤں کو افسانوں میں پیش کیا۔

جمیلہ ہاشمی کے افسانوں کے بیش تر کردار سکھ معاشرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہوں نے ان کرداروں کی زندگیوں کا عمیق مشاہدہ کیا۔ انہوں نے افسانوں میں بنتِ حوا کا استحصال، تقسیم ہند اور فسادات کو موضوع بنایا۔ ان کے افسانوں میں سیاسی وسماجی شعور کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں۔ رضیہ فصیح احمد نے انسانی نفسیات، معاشرتی و معاشی مسائل، عورت کے مسائل اور انسانی اقدار کے حوالے سے افسانے لکھے۔ سائرہ ہاشمی کے افسانوں کا بنیادی موضوع عورت کا دُکھ، کرب اور مصائب ہیں۔ عفرا بخاری کے افسانوں میں نفسیاتی حقیقت نگاری کا عنصر پایا جاتا ہے۔ انہوں نے عورت کی جنسی و جذباتی تشنگی اور نفسیاتی پیچیدگیوں کو موضوع بنایا۔

اُردو ادب کی ایک فعال تحریک حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک بھی تھی۔ حلقہ اربابِ ذوق کا آغاز ۲۹/اپریل ۱۹۳۹ء کو لاہور میں ہوا۔ حلقہ اربابِ ذوق کی تحریک نے اُردو ادب کی متفرق اصناف مثلاً شاعری، افسانہ، ناول، ڈراما اور تنقید میں وسیع اضافے کیے۔ حلقے نے جن جدید رویوں کو فروغ دیا اور جو نئے افکار و نظریات پیدا کیے ان کی بدولت اردو افسانے میں نمایاں تبدیلیاں سامنے آئیں۔ ''حلقہ اربابِ ذوق سے قبل افسانہ، دبستانِ یلدرم کی صورت میں رومانیت، دبستانِ پریم چند کے حوالے سے حقیقت نگاری، انگارے کی بغاوت اور ترقی پسند تحریک کی سماجی حقیقت نگاری کے مراحل طے کر چکا تھا۔ حلقے نے اس میں دروں بینی اور نفسیاتی گرہ کشائی کے عناصر داخل کیے اور ساتھ ہی ساتھ فنی حوالوں سے اس کی بنت کاری کے عمل کو نکھارا۔ اُردو افسانے پر حلقہ اربابِ ذوق کے اثرات انہی دو زاویوں سے اہم ہیں۔''(۳۰)

حلقے کے زیرِ اثر اردو افسانے میں تکنیکی تبدیلیاں بطورِ خاص اہم ہیں۔ یہ تحریک مغرب کی جدید تحریکوں سے متاثر اور تجدد کی داعی تھی۔ اس لیے علامتیت، تاثریت اور جدید نفسیات کے حوالے سے مغرب میں ہونے والے نئے تجربات کو افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں شامل کیا۔ ''نئے علائم اور رموز، تشبیہات و استعارات اور نئی تمثالوں کا اُردو افسانے میں چلن حلقہ اربابِ ذوق ہی کے زیرِ اثر ہوا۔ افسانے کی ساخت، کرداروں کی تخلیق، واقعات کی ترتیب و تنظیم اور مجموعی فضا و ماحول کی پیش کش میں داخلی عناصر کی بدولت ایک نیا پن پیدا ہوا۔ تحریک کی داخلی جہت چونکہ ارضی حوالوں سے تھی۔ اس لیے ماضی کے سرمائے کو بھی اہم سمجھا گیا اور موجودہ ماحول کے مطابق قدیم علائم و رموز، رسوم و روایات اور اساطیر سے

افسانے کی بنت کاری میں کام لیا گیا۔''(۳۱)

حلقہ اربابِ ذوق کے تحت لکھے گئے افسانوں میں اسلوب بلند آہنگ نہیں بلکہ لطافت، انکسار کو اہمیت دی گئی حلقہ اربابِ ذوق کے نظریات سے اس دور کے بیش تر افسانہ نگاروں نے اثر قبول کیا۔ ان میں ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار بھی شامل ہیں ان میں کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، حلقے کے جلسوں میں شریک ہوئے بلکہ کئی جلسوں کی صدارت بھی کی۔ تاہم ان افسانہ نگاروں کی پہچان ترقی پسند تحریک کے حوالے سے ہی رہی۔ حلقے سے خصوصی طور پر اثر قبول کرنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے لیکن جو زیادہ نمایاں ہوئے ان میں شیر محمد اختر، ممتاز مفتی، حسن عسکری، آغا بابر، رحمان مذہب، ممتاز شیریں، امجد الطاف، غلام علی چودھری، صلاح الدین اکبر، انتظار حسین، انور سجاد، خالدہ حسین، رشید امجد، منشا یاد اعجاز راہی، سمیع آہوجہ، احمد جاوید، مرزا حامد بیگ شامل ہیں۔

حلقے کے ابتدائی جلسوں میں زیادہ تر افسانے پڑھے جاتے اور ان افسانوں پر مختصر غیر رسمی تنقید ہوتی۔ حلقے میں میرا جی کی شمولیت سے جدید اردو نظم کو فروغ ہوا۔ میرا جی کی وفات کے بعد حلقے کے مزاج میں وسعت آئی اور مختلف اصناف ادب کے حوالے سے عمومیت پیدا ہوئی۔ چنانچہ میرا جی کی بے لاگ تنقید کی وجہ سے اہم شاعر، افسانہ نویس اور نقاد نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنے فن پاروں میں بہتر سے بہترین کی جانب توجہ مبذول کی۔ حلقے کے ابتدائی جلسوں میں نسیم حجازی اور شیر محمد اختر نے اپنے افسانے تنقید کے لیے پیش کیے بعد ازاں ترقی پسند تحریک سے وابستہ افسانہ نگار بیدی، اشک، کرشن چندر اور مہندر ناتھ نے تنقید کے لیے اپنی افسانوی تخلیقات پیش کیں۔ افسانہ کی صنف میں محولہ بالا افسانہ نگاروں کا مرتبہ بلند کرنے میں حلقہ اربابِ ذوق نے اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب کے مستند افسانہ نگار سعادت حسن منٹو بھی حلقہ اربابِ ذوق میں اپنے افسانے پیش کرتے رہے۔ یونس جاوید لکھتے ہیں:

''منٹو صاحب نے ۳ ستمبر ۱۹۵۰ء سے ۳۰ مئی ۱۹۵۴ء تک حلقے میں سترہ افسانے تنقید کے لیے پیش کیے۔۔۔ منٹو صاحب جب افسانہ پڑھنے کے لیے حلقے میں آتے اس دن حلقے میں حاضرین کی تعداد بہت بڑھ جاتی مثلاً انہوں نے جس اجلاس میں افسانہ ''موذیل'' پڑھا اس میں حاضرین کی تعداد ۱۸۷ تھی۔''(۳۲)

سعادت حسن منٹو کو عام طور پر ''جنس نگار'' سمجھا جاتا ہے کہ انہوں نے طوائف کے استعارے میں متعدد افسانے لکھ کر معاشرتی حقائق اور طوائف کی کرب ناکیوں کو پیش کیا۔ انھوں نے انسانی باطن

کے متنوع زاویے پیش کیے۔ منٹو نے ایک عام انسان کے ظاہر پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے اس کی باطنی دُنیا کو آشکار کیا۔ منٹو نے انسانی استحصال و جبر، انسانیت کش عناصر کو بے رحمی سے پیش کیا جس کے نتیجے میں منٹو پر مقدمات چلے۔ لیکن منٹو اپنے مؤقف پر ڈٹے رہے۔

ممتاز مفتی انسانی فطرت اور نفسیات کے گہرے نبض شناس سمجھے جاتے ہیں انہوں نے انجانی انسانی نفسیات کے جذبوں کی نقاب کشائی کی۔ جنس کو عموماً پردہ اخفا میں رکھنا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ ممتاز مفتی نے اپنے افسانوں ''چپ، احسان علی، کھونٹ والا بابا'' میں انسانی زندگی اور انسانی فطرت کو نفسیاتی نقطۂ نظر سے دیکھا اور پیش کیا ہے ''ممتاز مفتی کے کردار گوشت پوست کی دنیا سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی آنکھیں ٹٹولتی اور انگلیاں گفتگو کرتی ہیں۔ چنانچہ ان کا فن اظہار اور گریز کی ان کیفیتوں سے عبارت ہے جو پیدا تو زیرِ سطح ہوتی ہیں، لیکن بیرونِ سطح تلاطم بپا کرتی ہیں۔''(۳۳)

محمد حسن عسکری نے شعور کی رو اور آزاد تلازمہ خیال کی تکنیک کو اپنے افسانوں میں برتا۔ ماہر افسانہ نگار نے کرداروں کے باطن میں برپا ہونے والے ہیجانات اور نفسی پیچیدگیوں کی نقاب کشائی کی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں شعور کی رو کی تکنیک کو برتا اور ہم جنس پرستی، جنسی تلذذ، جنسی تشنگی، نفسی انتشار، داخلی خود کلامی کو افسانوں میں برتا، چنانچہ ان کے افسانے ''حرام جادی، پھسلن، چائے کی پیالی'' کو بہت وقعت ملی۔ حسن عسکری نے قیامِ پاکستان سے قبل بہت عمدہ افسانے لکھے جنہیں ادبی حلقوں میں بہت پذیرائی ملی۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کی توجہ تنقید کی جانب زیادہ مرکوز رہی۔ آغا بابر نے اُدھیڑ عمر لوگوں کے جنسی جذبات کو افسانوں میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے جنس کے منہ زور جذبے اور سنگین سماجی حقائق کو افسانوں میں کامیابی سے پیش کیا۔ آغا بابر کے اس نوع کے افسانوں میں تعجّب، رات والے، توازن اور باجی ولایت کو اہمیت حاصل ہے۔ آغا بابر کے افسانوی مجموعوں میں شامل افسانوں کی بابت ڈاکٹر ضیا الحسن لکھتے ہیں:

> ''افسانہ نگاری کا جوہر ان کے افسانوں سے ظاہر ہے لیکن وہ اپنے اسلوبی و موضوعاتی دائرے کے اسیر ہو کر رہ گئے۔ جس کی وجہ سے فنی وسعت سے محروم ہو گئے۔ انہوں نے زندگی کو ملکیت میں دیکھنے کی بجائے ایک خاص عمر کے کرداروں کا مطالعہ ان کے جنسی میلانات و مسائل کی روشنی میں کیا ہے۔ ان کے افسانوں کی اہم خوبی جزئیات نگاری ہے۔ وہ اپنے بیان کو مکمل تفصیلات سے مزین کرتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی ابہام باقی نہیں رہتا اور افسانے کا منظر نامہ روشن ہو جاتا ہے۔ ان کے افسانوں کی خوبی بھی یہی ہے اور خامی بھی۔''(۳۴)

صلاح الدین اکبر کے دو افسانوی مجموعے ''البم اور سائے'' اور '' ناگفتہ بہ'' کے نام سے شائع ہوئے۔ افسانہ نگار نے اپنے افسانوں میں زندگی کے متنوع موضوعات کو پیش کیا ہے۔ سید امجد الطاف نے متوسط طبقے کے نفسیاتی مسائل اور فطرت کی صداقتوں کو افسانوں میں بیان کیا۔ اے حمید نے اپنے افسانوں کو رنگین اسلوب اور رومانوی عناصر سے سجا کر قارئین کے سامنے پیش کیا۔ یہ اسلوب غیر تخلیقی نثر نگاری کے لیے تو بہترین تھا لیکن فنِ افسانہ نگاری کے لیے سمِ قاتل ثابت ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ بہت لکھنے کے باوجود وہ سنجیدہ نقادوں کی توجہ حاصل نہیں کر سکے۔ (۳۵)

نشاط فاطمہ اور الطاف فاطمہ نے متوسط طبقے کے مسائل کو افسانوں میں پیش کیا۔ اعجاز حسین بٹالوی نے حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس میں متعدد افسانے پیش کیے۔ انہوں نے واقعہ نگاری اور کردار نگاری پر زیادہ توجہ مبذول کی۔ ڈاکٹر ضیاالحسن لکھتے ہیں:

''اعجاز حسین بٹالوی نے اپنے ادبی کیریئر کا آغاز بہت توانائی سے کیا۔ ایک زمانے میں وہ حلقے کے بہت متحرک اور سرگرم رُکن رہے۔ انہوں نے حلقے کے اجلاسوں میں متعدد افسانے پیش کیے لیکن رفتہ رفتہ اپنی پیشہ وارانہ سرگرمیوں میں محو ہو گئے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانوں کا مجموعہ بھی شائع نہیں ہو سکا۔ انہیں واقعہ نگاری اور کرداری نگاری پر گرفت حاصل تھی انہوں نے جذبہ واحساس کو اپنے افسانوں کی بُنت میں بنیادی قوت کے طور پر برتا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے افسانے اپنے قاری کی توجہ حاصل کر لیتے ہیں۔'' (۳۶)

اشفاق احمد نے معاشرے کے جیتے جاگتے کرداروں کو اپنے افسانوں میں پیش کیا اشفاق احمد نے معاشرے میں اصلاح پسندی کو فروغ دیا۔ انہوں نے انسانی زندگی میں ''محبّت'' کو اولیت دی انہوں نے ایک خوش گوار سماجی زندگی کا تصوّر مختلف معاشرتی رشتوں سے قائم کیا۔ وہ ایک پُرسکون اور پُرامن گھریلو زندگی کو مقدم سمجھتے ہیں۔ انہوں نے محبّت کے بل بوتے پر زندگی کے گوشوں کو روشن کیا ہے اس نوع کے افسانوں میں ''اُجلے پھول، شب خون، امی، گڈریا'' شامل ہیں۔

انتظار حسین کے افسانوں کی بنیاد ماضی کی یاد پر ہے علاوہ ازیں ان کے افسانوی اسلوب پر داستانوی، مذہبی عناصر، صحائف اور دیو مالا کا غلبہ ہے انہیں اردو کے علامتی افسانہ نگاروں میں مرکزی مقام حاصل ہے۔ انہوں نے توہمات، عوامی مفروضے، ضعیف الاعتقادی، اخلاقی زوال، ہوس زر، فرد کے اخلاقی و روحانی زوال، زندگی کی بے معنویت، فرد کے اضطراب، باطنی کش مکش، معاشرتی زوال، معاشی بحران، ہجرت کے مشاہدات و تجربات کو تخلیقی توانائی کے ساتھ افسانوں میں پیش کیا۔ ڈاکٹر

انوار احمد لکھتے ہیں:

> ''انتظار حسین اور کہانی لازم و ملزوم ہے۔۔۔انتظار کے ہاں پاکستانی سیاست کے نشیب و فراز اور سماجی تغیّرات کی گواہی موجود ہے گویا وہ'' آج'' کا شاہد ہے۔انتظار حسین کے ہاں سفر ایک استعارہ ہے جو انسان کا مقدر ہے اور جو خود اسے اپنے بچپن سے انسان کے بچپن تک لے گیا ہے وہ بار بار ماضی کی جانب پلٹتا ہے مگر حال کی خاطر اپنے عہد کے آشوب کو سمجھنے کی خاطر اور اپنے اجتماعی وجود کی کرچیاں چُننے کی خاطر، انتظار حسین کو اپنے بعض معاصر افسانہ نگاروں پر یہ تفوق حاصل ہے کہ وہ کہنے کا ڈھنگ جانتا ہے وہ پیچیدہ سے پیچیدہ ذہن و جذباتی واردات کے بیان میں بھی لفظوں کے نرخرے کٹنے نہیں دیتا۔ وہ اردو زبان و ادب سے تخلیقی سطح پر آشنا ہے دوسرے وہ اپنے عصری سوالوں اور حوالوں سے بیگانہ نہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ تاریخ و تہذیب کے پُر اسرار اور پیچیدہ جنگل میں اُتر کر اظہار و ابلاغ کے علامتی وسیلے کو معتبر بناتا ہے۔'' (۳۷)

شہرِ افسوس، کایا کلپ، زرد کتا اور کچھوے کا شمار اچھے افسانوں میں ہوتا ہے۔ سید قاسم محمود کے بیش تر افسانوں میں سوانحی رنگ کی جھلکیاں ہیں تو کہیں وہ معاشرتی سنگینیوں اور زندگی کی تلخیوں کو موضوع بناتے ہیں انہوں نے قیامِ پاکستان کے قوت پائی جانے والی ہندو مسلم کشیدگی، فرقہ وارانہ فسادات، بچپن کی بھولی بسری یادوں، جنسی نفسیات کو افسانوی کا موضوع بنایا۔ ان کے دو افسانوی مجموعے ''دیوار پتھر کی'' اور ''قاسم کی مہندی'' منظرِ عام پر آچکے ہیں سماجی شعور کے حامل ان افسانوں میں ماہر افسانہ نگار نے بھی جنسی جذبات کو مذہب کے پردے میں پیش کیا ہے اور کہیں اُمتِ مسلمہ کی ترقی کے منصوبوں کو سعیدہ سے شادی میں پیش کیا ہے۔ خان فضل الرحمان ہندی اسلوب کے حامل افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں میں جنس کا غلبہ رہتا ہے وہ خود بھی جنسی موضوعات سے حظ اُٹھاتے ہیں اور قاری کو بھی شامل کرتے ہیں۔ انور سجاد کا شمار علامتی و تجریدی افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ''تکنیک اور موضوع دونوں زاویوں سے حلقہ اربابِ ذوق کی جدیدیت کو آگے بڑھایا اور زمانہ حال کے نئے رویے کو نہ صرف قبول کیا بلکہ جدید انسان کی شکست و ریخت پر بھی افسانے لکھے۔ انور سجاد کے بیشتر کردار وجود کی معنویت کو تلاش کرتے اور اپنے اندر کا خلاپُر کرنے کی سعی کرتے ہیں انور سجاد نے اُردو افسانے کو ایک نئی جہت دی ہے اور اسے اپنے زمانے کی جدید تحریکوں سے ہم قدم کر دیا ہے۔ انہوں نے اپنے افسانوں کی تشکیل میں ابہام سے کام لیا۔ انور سجاد کے متعدد افسانے خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ رحمان مذنب بھی حلقہ اربابِ ذوق کے متحرک رُکن رہے ہیں۔ انہوں نے حلقہ اربابِ ذوق کے اجلاس میں تنقیدی مضامین

اور افسانے پیش کیے۔ انہوں نے "طوائف" کو اپنے افسانوں کا بنیادی استعارہ بنایا۔ انہوں نے جاگیردارانہ نظام، سرمایہ دارانہ نظام اور خانقاہی نظام کی مکروہ صورتوں کو پیش کیا۔ یونس جاوید نے متوسط طبقے کے افراد کی زندگی میں جھانکا اور اس طبقے کی کدورتوں، محبتوں، نفرتوں، عداوتوں اور لڑائی جھگڑوں کو تخلیقی توانائی سے پیش کیا۔ فرخندہ لودھی نے زندگی کی خوبصورتیوں اور تلخیوں کو جزئیات سمیت پیش کیا۔ جمیلہ ہاشمی نے سکھ معاشرے کے رسوم ورواج کو افسانوں میں جگہ دی۔ سائرہ ہاشمی نے عورتوں کی نفسیات کو افسانوں میں پیش کیا۔ عذرا اصغر نے وطن سے محبت کے جذبے کو کامیابی سے افسانوں میں پیش کیا۔ علاوہ ازیں انہوں نے ماتا کی محبّت کے روپ کو پیش کیا۔ مسعود مفتی کے افسانوں کا بنیادی وصف ارضی رجحان ہے یہ دائمی اقدار اور بلند اخلاقی معیار کو کامیابی سے پیش کرتی ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کے مخفی گوشوں کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ غلام الثقلین نقوی نے پاکستان کی ثقافت، زمین سے محبت، مٹی سے لگاؤ کو تخلیقی ہنرمندی سے پیش کیا۔ انہوں نے بنیادی انسانی قدروں کے زوال پر نوحہ کناں ہونے کی بجائے انسان کی قوتِ عمل کو اپنے افسانوں میں بڑھاوا دیا۔ "چنبلی، بُڈھا دریا، جلی مٹی کی خوشبو، نقوی کے تخلیقی اظہار کے عمدہ افسانے ہیں۔

حلقہ اربابِ ذوق کے افسانوی ادب میں مسعود اشعر، رشید امجد، امجد جاوید، مشتاق قمر، احمد داؤد، اعجاز راہی، انور زاہدی، شمس نعمان، سجاد حیدر، مسعود شاہد، جمیل الزمان نے عمدہ اضافے کیے۔ انہوں نے داخلی محسوسات کو افسانے کی صورت میں پیش کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق میں نئے افسانہ نگار (آج بھی اپنی تخلیقات پیش کرتے رہتے ہیں لیکن آج حلقہ اربابِ ذوق ایک ادبی پلیٹ فارم کی حیثیت اختیار کر چکا ہے جہاں اہلِ قلم ادیب اور شاعر حضرات ایک ادبی سماجی سرگرمیوں میں شامل ہوتے ہیں۔ (۳۹) بہر حال حلقہ اربابِ ذوق ایک ایسی مسلسل تحریک تھی جس نے ایک طویل عرصے تک ادبی دنیا کو متاثر کیا۔ حلقہ اربابِ ذوق نے ادیبوں کی فنی تربیت کے ساتھ ساتھ انہیں نئے افکار ونظریات کے لیے انہیں ذہنی طور پر آمادہ کیا۔ ڈاکٹر شفیق انجم "اردو افسانہ" میں لکھتے ہیں:

"ساٹھ کی دہائی میں نظم اور افسانے کو ایک نیا موڑ دینے والے ادیب حلقہ اربابِ ذوق ہی کے پروردہ تھے اور ان کے بعد آنے والوں میں بھی یہ فیض جاری رہا۔ اس حوالے سے یہ کہنا بجا ہے کہ اردو افسانے پر حلقہ اربابِ ذوق کے اثرات کسی ایک عہد تک محدود نہیں بلکہ یہ سلسلہ بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے آخر تک پھیلا ہوا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بحیثیت تحریک، حلقے کی انفرادیت کا زمانہ، آغاز سے ترقی پسند تحریک کے خاتمے تک ہے۔ اس کے

حوالہ جات

۱۔ وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' اردو اکیڈمی سندھ کراچی ۱۹۶۶ء، ص ۱۶

۲۔ ڈاکٹر شفیق انجم ''اردو افسانہ'' پورب اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۷ء، ص ۳۲

۳۔ ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' عزیز بک ڈپو لاہور طبع سوم، ص ۳۷۰

۴۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ ''اردو افسانے کی روایت'' دوست پبلشرز اسلام آباد ۲۰۱۰ء، ص: ۵۶

۵۔ ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی مختصر تاریخ'' محولہ بالا ۰۳، ص: ۳۷۴

۶۔ ڈاکٹر شفیق انجم ''اردو افسانہ'' محولہ بالا ۰۲، ص ۵۵

۷۔ ڈاکٹر محمد عالم خاں ''اردو افسانے میں رومانوی رجحانات، مجلس ترقی ادب لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۶۸۱۔۶۸۲

۸۔ ڈاکٹر محمد صادق ''ترقی پسند افسانے کے پچاس سال''، ''مشمولہ'' ترقی پسند ادب، مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس، عاشور کاظمی، مکتبہ عالیہ لاہور ۱۹۹۴ء، ص ۳۷۷

۹۔ سجاد ظہیر ''روشنائی''، مکتبہ دانیال کراچی بار سوم ۲۰۰۵ء، ص ۱۹۳

۱۰۔ ڈاکٹر انور سدید ''اردو ادب کی تحریکیں''، انجمنِ ترقی اردو پاکستان کراچی طبع چہارم ۱۹۹۹ء

۱۱۔ عزیز احمد ''ترقی پسند ادب'' کاروانِ ادب ملتان ۱۹۹۳ء، ص ۵۵

۱۲۔ ڈاکٹر فوزیہ اسلم ''اردو افسانے میں اسلوب اور تکنیک کے تجربات'' پورب اکادمی اسلام آباد ۲۰۰۷ء، ص ۱۱۹

۱۳۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی ''اردو ادب نگاری پر ایک نظر'' مشمولہ ''تنقیدی زاویے''، اردو اکیڈمی کراچی ۱۹۵۱ء، ص ۳۳۴

۱۴۔ سید وقار عظیم ''نیا افسانہ''، اُردو اکیڈمی کراچی طبع سوم ۱۹۹۰ء، ص: ۹۰

۱۵۔ ڈاکٹر محمد صادق ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ''، ص ۱۳۴

۱۶۔ عزیز احمد ''ترقی پسند ادب''، محولہ بالا/۱۱، ص ۱۰۷۔۱۰۸

۱۷۔ ایضاً

۱۸۔ ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی ''اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک''، ص ۱۹۱۔۱۹۳

۱۹۔ سید وقار عظیم ''نیا افسانہ'' محولہ بالا ۱۴، ص ۱۲۴۔۱۲۵

۲۰۔ علی سردار جعفری ''ترقی پسند ادب''، ص ۱۶۷۔۱۶۸

۲۱۔ ڈاکٹر محمد صادق ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ'' ص ۱۴۳

۲۲۔ ڈاکٹر وزیر آغا ''اردو کا افسانوی ادب''، بہار اردو اکادمی ۱۹۸۷ء، ص: ۸۷

۲۳۔ گوپی چند نارنگ ڈاکٹر (مرتبہ) ''اردو افسانہ روایت اور مسائل'' ۱۹۸۱ء، ص ۱۳۳

۲۴۔ ڈاکٹر اسلم جمشید پوری ''ترقی پسند اردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار'' موڈرن پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی ۲۰۰۳ء، ص

۲۵۔ ڈاکٹر شہناز ''ترقی پسند تحریک اور اردو افسانہ'' ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سن ندارد، ص ۱۷۶

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۸۳

۲۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی ''معاصرِ ادب''، سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۹۱ء

۲۸۔ ڈاکٹر انور سدید ''اردو افسانہ عہد بہ عہد'' مقبول اکیڈمی لاہور، س ن، ص: ۴۳

۲۹۔ سید وقار عظیم ''داستان سے افسانے تک'' الوقار پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۰، ص ۳۸۱

۳۰۔ ڈاکٹر شفیق انجم ''اردو افسانہ''، محولہ بالا ۲، ص ۳۲۷

۳۱۔ ایضاً

۳۲۔ یونس جاوید ''حلقہ اربابِ ذوق''، مجلسِ ترقی ادب لاہور ۱۹۸۴ء، ص ۳۳۔۳۴

۳۳۔ انور سدید ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ، ص ۵۸۳

۳۴۔ ڈاکٹر ضیاالحسن ''حلقہ اربابِ ذوق اور افسانہ نگاری''، مشمولہ بازیافت لاہور شمارہ ۱۹ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۱ء، ص ۲۲۴

۳۵۔ ایضاً، ص ۲۲۴۔۲۲۵

۳۶۔ ایضاً، ص ۲۲۴

۳۷۔ ڈاکٹر انوار احمد ''اُردو افسانہ ایک صدی کا قصہ''، مثال پبلشرز فیصل آباد ۲۰۱۰ء، ص ۴۱۵

۳۸۔ ڈاکٹر انور سدید ''اُردو ادب کی تحریکیں''، محولہ بالا ۳۱

۳۹۔ ڈاکٹر ضیاالحسن، محولہ بالا ۳۴، ص ۲۲۶

۴۰۔ ڈاکٹر شفیق انجم ''اُردو افسانہ''، محولہ بالا ۲، ص ۳۲۸

۴۱۔ ڈاکٹر شفیق انجم ''اُردو افسانہ''، محولہ بالا ۲، ص ۲۲۹۔۲۳۰

۴۲۔ ایضاً، ص ۳۳۰